ملک صفدر حیات (سیریز نمبر 42)
تین بٹا ایک
(تحریر حسام بٹ)
عقیل قریشی - یاسر حسنین
- ناصر بلوچ - محمد سجاد بھٹی
سسپنس ڈائجسٹ : اکتوبر 2009
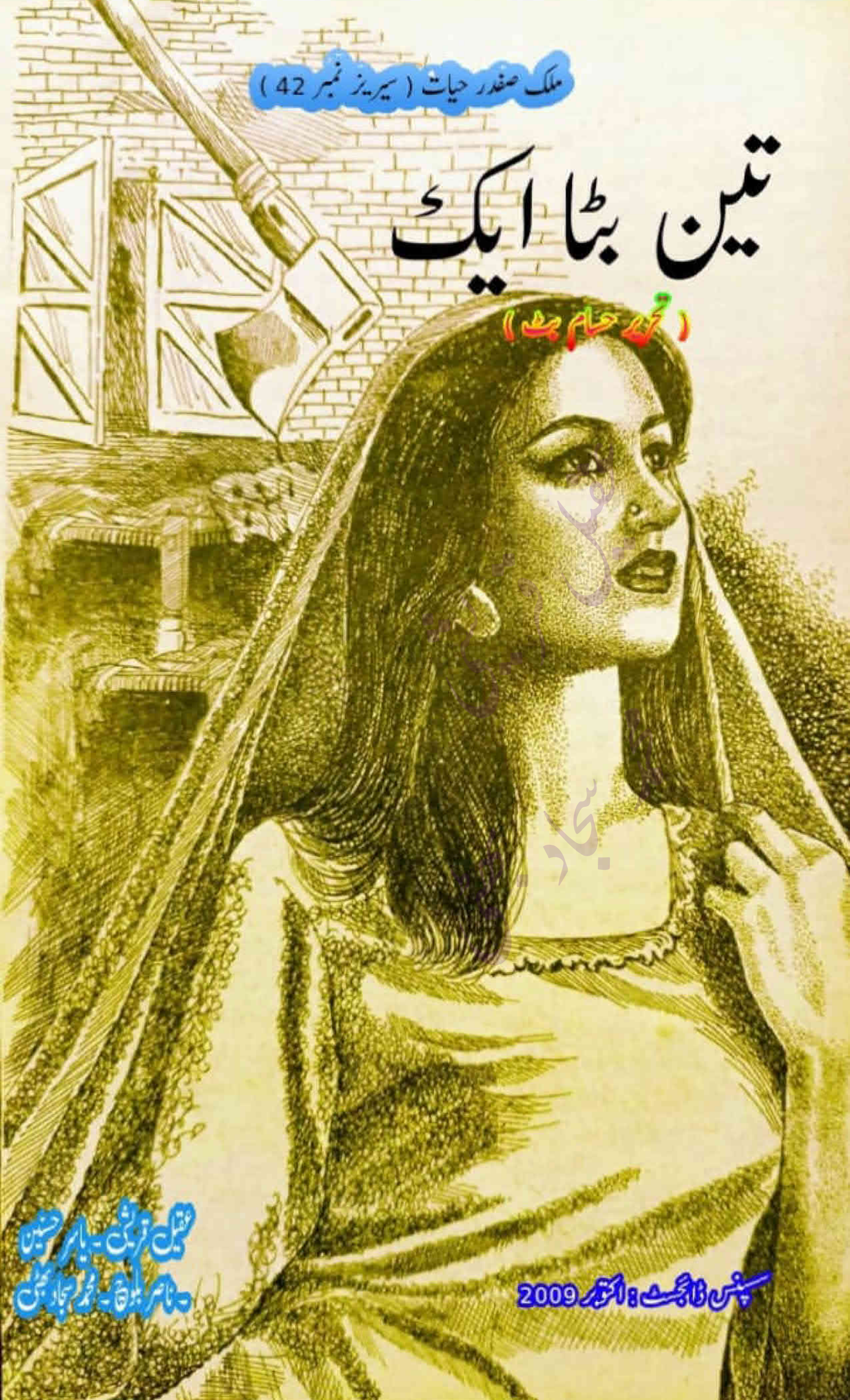
ملک صفدر حیات

تین بٹا ایک

زندگی کبھی دو جمع دو چار ..... جیسے سیدھے اصولوں کے تحت بسر نہیں کی جا سکتی یہ تو ضرب اور تقسیم جیسے پر پیچ رستوں سے گزرنے کی عادی ہوتی ہے۔ اس کا ہر زاویہ جیو میٹریکل انداز میں آگہی کے کئی در وا کر دیتا ہے ..... مگر اک انسان ہے کہ دولت کی ہوس میں قدرت کا نظام اور حساب کتاب کا دن بھلائے بیٹھا ہے ..... جس رستے پر اس کے قدم اٹھ گئے تھے اس کا انجام اگر بھیانک نہ ہوتا تو کیا ہوتا

ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک اور لہورنگ واقعہ

پچھلے دنوں جنوبی پنجاب کے ایک علاقے میں ایک ہولناک اجتماعی قتل کی واردات پیش آئی جب ایک ہی خاندان کے تمام افراد کو سوتے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پریس اور میڈیا نے اس واقعے کی بھرپور کوریج کی اور ''جتنے منہ اتنی باتیں'' کے مصداق تحقیقی جگادریوں نے اس واردات کے بارے میں بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق قیاس آرائیاں کیں۔ بعدازاں، اس واقعے کے پس منظر کے حوالے سے جو شواہد اور حقائق سامنے آئے وہ آپ سب کے علم میں ہیں۔ دنیا کے کسی بھی مسئلے اور تنازع کی جڑ کھودیں، وہاں زن، زر اور زمین میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ بیٹھے نظر آتے ہیں!

ہمارے زمانے میں پریس اور میڈیا اتنا طاقتور نہیں تھا بلکہ میڈیا کا تو دور دور تک نام ونشان سننے اور دیکھنے میں نہیں آتا تھا اور پریس میں بھی وہی خبریں اپنی جگہ بنا پاتی تھیں جن کے پیچھے کوئی بڑا ایشو موجود ہوتا تھا۔ آج والی آسانی اور سہولت ہمیں میسر نہیں تھی۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کہانی شروع کرنے کے بجائے میں نے کوئی اور ہی قصہ چھیڑ دیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل، اس تمہید کا مقصد ''زن، زر اور زمین'' کی ہلاکت خیزیوں کو اجاگر کرنا تھا اور کوئی بھی کہانی یا داستان ان کے ذکر سے خالی نہیں ..... !

اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا، موضع شمشیر پور میں دہرے قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے۔ شمشیر پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اگرچہ وہ تھانے سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ ان دنوں تھانوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی جتنی کہ آج کل ہے اور تھانوں کے اندر موجود نفری کا بھی آج کل کی نفری سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اگر مقابلہ ناگزیر بھی ٹھہرے تو یہی کہنا مناسب ہوگا کہ یہ مقابلہ ہاتھی اور چوہے کے مابین ہے۔

میں نے اطلاع کنندہ کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔ اس شخص کا نام بشیر لوہار تھا اور وہ موضع شمشیر پور ہی کا رہنے والا تھا۔ وہ عام سی شکل صورت اور متناسب بدن کا مالک تھا۔ اس نے چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ عمر یہی کوئی پینتالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔

میں نے بشیر لوہار سے سوال کیا۔ ''ہاں بھئی، کون کون قتل ہوا ہے؟''

''وہ دونوں سگے بھائی تھے تھانیدار صاحب!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''بڑے کا نام فیاض اور چھوٹے کا ریاض تھا۔ دونوں کبرو تھے جی۔''

''تمہارا ان دونوں سے کیا رشتہ ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کے انداز سے مجھے اتنا اندازہ تو ہوگیا تھا کہ وہ مقتولین کا باپ نہیں ہوسکتا تھا۔ ہاں، البتہ چاچا، ماما، تایا وغیرہ میں سے کوئی ہوسکتا تھا۔ بشیر لوہار کے جواب نے میرے آخرالذکر اندازے کی بھی نفی کردی۔ اس نے دل گرفتہ انداز میں بتایا۔

''میری ان سے کوئی رشتے داری نہیں تھی جناب ..... بس یہ سمجھ لیں کہ ہم سب ایک ہی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ان کا پڑوسی ہوں جی۔''

''پڑوسی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم اکیلے ہی یہ اطلاع دینے آئے ہو یا مقتولین کا کوئی قریبی عزیز بھی تمہارے ساتھ ہے؟''

''میں اکیلا نہیں ہوں جی، دو بندے باہر برآمدے میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم میں سے کوئی بھی فیاض اور ریاض کا رشتے دار نہیں۔ وہ دراصل بات یہ ہے جناب کہ......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ان کے گھر میں ایسا کوئی بھی نہیں جو اس واقعے کی رپورٹ کرنے آپ کے پاس آتا۔ وہ دونوں تو قتل کر دیے گئے۔ باقی گھر میں ان کی ماں زاہدہ ہے یا پھر چھوٹا بھائی فرمان علی جس کی عمر تین سال کے قریب ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''کیا ان کا باپ موجود نہیں؟''

''نہیں جی۔'' بشیر لوہار نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''فتح محمد کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی تم لوگوں کے ساتھ شمشیر پور چلتا ہوں۔ تم بھی باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو...... اور ہاں، یہ تو بتاؤ کہ تم تینوں شمشیر پور سے یہاں کیسے پہنچے ہو؟''

شمشیر پور اور میرے تھانے کے بیچ لگ بھگ چار میل کی مسافت حائل تھی اور ظاہر ہے، وہ پیدل چل کر تو نہیں آئے ہوں گے۔ بشیر لوہار نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''جی، ہم تانگے میں بیٹھ کر آئے ہیں۔ باہر اصغر اور صدیق موجود ہیں جن میں صدیق ایک کوچوان ہے اور ہم اسی کے تانگے پر سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''کیا اس تانگے میں مزید دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں بہت آسانی سے گنجائش نکل آئے گی۔''

میں نے بشیر لوہار کو باہر برآمدے میں بیٹھنے کو کہا اور کانسٹیبل مراد علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مراد میرے تھانے کا ایک ہوشیار اور چاق چوبند اہلکار تھا اسی لیے میں نے اسے اپنے ساتھ شمشیر پور لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آیا تو میں اسے روانگی سے متعلق مختلف ہدایات دینے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم سب صدیق کوچوان کے تانگے میں بیٹھے موضع شمشیر پور کی جانب رواں دواں تھے۔ اس سفر کے دوران میں میری اصغر، صدیق اور بشیر سے اس واردات کے حوالے سے بات چیت بھی جاری رہی تھی اور میں کافی مفید باتیں جاننے میں کامیاب رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم اپنے مطلوبہ گاؤں پہنچ گئے۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، شمشیر پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں بہ مشکل اسی، نوے گھر آباد ہوں گے۔ میرا تھانہ ''حافظ آباد، پنڈی بھٹیاں'' روڈ پر واقع تھا اور وہاں سے ایک کچا راستہ شمشیر پور کی طرف آتا تھا۔ یہ کچا راستہ شمشیر پور کے اندر سے گزر کر جنوب میں ''چک میراں'' نامی ایک گاؤں تک چلا جاتا تھا۔ اس راستے کی خوبصورتی یہ تھی کہ اس کی دونوں جانب سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ تا حدِ نگاہ پھیلا دکھائی دیتا تھا اور راستے کے ایک پہلو میں کسی چھوٹی نہر کے سائز کا ایک کھالا بھی بہتا تھا جسے مقامی دیہاتی زبان میں ''سُوا'' کہا جاتا تھا۔ یہ سُوا اپنے دائیں بائیں کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا یا پھر موسم گرما کی تپتی، سلگتی دوپہروں میں گاؤں کے نوجوان اور جوان اس میں نہاتے تھے۔ آج کل گلابی جاڑے کے دن تھے لہٰذا اس سُوے کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا!

ہم گاؤں میں داخل ہوئے اور سیدھے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں دُہرے قتل کی یہ واردات ہوئی تھی۔ وہ دراصل مویشیوں والا ایک باڑا تھا جو مقتولین کے گھر کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے تانگے سے نیچے اترے پھر میں بشیر لوہار کی راہ نمائی میں مذکورہ باڑے کے اندر داخل ہو گیا۔

جب ہم تانگے کو چھوڑ رہے تھے تو میں نے باڑے کے دروازے پر درجن بھر افراد کا جمگھٹا دیکھا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ دائیں بائیں چھٹ گئے تھے لہٰذا ہمیں ان سے کچھ بھی نہیں کہنا پڑا تھا۔ پولیس کی وردی کی اپنی ہی ایک زبان ہوتی ہے!

باڑے کے صحن میں پہلو بہ پہلو دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان دونوں چارپائیوں پر دو لاشیں ڈھکی نظر آ رہی تھیں۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ انہیں بعد میں چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ میرے حکم پر کانسٹیبل مراد علی نے لاشوں کے اوپر سے چادریں ہٹا کر انہیں قابلِ مشاہدہ و قابلِ معائنہ بنا دیا۔

بشیر لوہار نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ فیاض اور ریاض نامی وہ دونوں بھائی گبرو تھے۔ فیاض کی عمر میرے اندازے کے مطابق، بائیس سال رہی ہوگی جبکہ ریاض لگ بھگ انیس کا نظر آتا تھا۔ بعد ازاں، میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ فیاض، ریاض سے تین سال بڑا تھا۔ دونوں الگ الگ

چارپائیوں پر زندگی سے خالی پڑے تھے، اس طرح کہ ان کے وجود کے بالائی حصوں کا خانہ خراب کر دیا گیا تھا۔

دونوں کی لاشیں خون میں لت پت تھیں۔ جسم کے اوپری حصوں خصوصاً سر، چہرہ، گردن، سینہ اور دیگر اعضا کو کلہاڑی کے متعدد وار کر کے زخموں سے چور کر دیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ خطرناک کٹ کھوپڑی اور گردن پر نظر آ رہے تھے جو یقیناً ان کی موت کا سبب بھی تھے۔ ان لاتعداد گھاؤ سے خارج ہونے والے خون نے ان کے لباسوں کے علاوہ چارپائیوں پر بچھے ہلکے پھلکے بستروں کو بھی پوری طرح رنگین بنا دیا تھا۔ موسم کی خنکی نے خارج شدہ خون کے جمنے میں اچھی خاصی مدد کی تھی۔

وہ ماہِ اکتوبر کے ابتدائی ایام تھے۔ دن میں موسم خاصا خوشگوار رہتا تھا لیکن جیسے ہی دن ڈھلنے لگتا، فضا میں ہلکی ٹھنڈک شامل ہو جاتی تھی اور رات میں لازماً کچھ نہ کچھ اوڑھ کر سونا پڑتا تھا، خاص طور پر کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنے والوں کو تو چادر یا کھیس وغیرہ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں مقتول بھائی بغیر کچھ اوڑھے سوئے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ان کے اوپر سے جو چادریں ہٹوائی تھیں وہ ان کا اوڑھنا نہیں تھیں۔ میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ لاشوں کی دریافت کے بعد ڈھانپنے کے لیے ان پر وہ چادریں ڈالی گئی تھیں۔ یا تو قاتل ان کے اوڑھنے کے کپڑے ساتھ لے گیا تھا اور یا پھر انہوں نے کوئی کپڑا اوڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ ہر دو صورت میں، صورتِ حال بڑی پراسرار، حیرت انگیز، گمبھیر اور خاصی الجھی ہوئی تھی۔

اس سے بھی زیادہ تشویش ناک اور قابلِ غور بات یہ تھی کہ دونوں بھائیوں کی جانب سے کسی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ جب کسی شخص پر کلہاڑی کے وار کیے جاتے ہیں تو چاہے وہ سویا ہوا ہی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور کرتا ہے پھر یہ دو افراد کے قتل کا معاملہ تھا، اس میں تو مزاحمت کی کوشش واضح طور پر دکھائی دینا چاہیے تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دونوں رضاکارانہ طور پر قتل ہوئے تھے..... وہ دونوں بڑی شرافت سے آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ قاتل آیا، تیز دھار کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا اور واپس چلا گیا۔ انہوں نے اس یلغار کے خلاف اف تک نہ کی حتیٰ کہ ان کی لاشوں نے بھی بڑے صبر اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ درجنوں مہلک وار

کھا کر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں..... جب کہ فطری ردِعمل اس بات کا متقاضی تھا کہ ہر وار پر ان کے بدن تڑپتے اور پھڑکتے اور.....!

اس دوہرے قتل کی واردات میں "سوچنے اور سمجھنے" کے لیے بہت کچھ تھا اور ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ صورتِ حال مجھے کسی بھی طور پر ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے بلکہ امکان اس بات کا تھا کہ پوری دال ہی کالی ہے!

ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کہ وہ کچھ اوڑھے بغیر کھلے آسمان کے نیچے سوئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاتل ان کے "اوڑھنے" اپنے ساتھ لے گیا تھا اور دوسری بات یہ بھی طے تھی کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک سوچی سمجھی انتقامی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور عین ممکن تھا کہ جب ان پر کلہاڑیاں برسائی جا رہی تھیں تو ان لمحات میں وہ لوگ گہری اور بے خبری کی نیند میں ہوں..... انہیں کسی خاص "طریقے" سے بے خبری کی "نیند" میں پہنچایا گیا ہو تاکہ قاتل کو اپنے "کام" میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو!

میں نے تفصیلی معائنے کے بعد دونوں لاشوں کو دوبارہ چادروں سے ڈھک دیا اور انہیں سرکاری اسپتال پہنچانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ فیاض اور ریاض کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم بہت ضروری تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے خدشات کی تسکین کر سکتی تھی۔ مجھے امید تھی، یہ تسکین، تصدیق کی حامل ہو گی!

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مذکورہ باڑے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ باڑے کا رقبہ لگ بھگ آٹھ مرلے رہا ہو گا۔ کراچی میں رہنے والے اسے دو سو گز کا پلاٹ تصور کر لیں۔ باڑے کے عقبی حصے میں دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں ایک نسبتاً چھوٹا اور دوسرا بڑا تھا۔ چھوٹے کمرے کے اندر مویشیوں کا کھاجا وغیرہ بھرا ہوا تھا اور کچھ کھیتی باڑی کا سامان بھی رکھا نظر آ رہا تھا۔ بڑے کمرے میں کوئی قابلِ ذکر شے موجود نہیں تھی۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت وہاں مویشیوں کو "پارک" کیا جاتا تھا۔

دونوں کمروں کے ٹیکنیکل معائنے کے بعد میں کشادہ صحن میں نکل آیا۔ جس کی ایک دیوار کے ساتھ چار مویشی موجود تھے۔ ان میں دو بیل اور دو بھینسیں تھیں۔ ایک بھینس کالی اور دوسری بھوری تھی۔ یہ چاروں بے زبان جانور اپنی کنڈلیوں پر بندھے خاصے افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ صحن کے دوسرے کونے میں دو بکریاں اور ایک بکرا بھی بندھا ہوا نظر آیا۔

اس باڑے میں داخلے کے دو دروازے تھے جن میں سے ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا تھا۔ مقتولین کا گھر گلی کے آخری کنارے پر واقع تھا یعنی یہ ایک کارنر کا مکان تھا جسے دو گلیوں کا ساتھ میسر تھا۔ باڑا، گھر کے پچھواڑے واقع تھا جس کا ایک دروازہ عقبی گلی میں اور دوسرا پہلو والی گلی میں کھلتا تھا۔ ہم اسی، پہلو والے دروازے سے باڑے میں داخل ہوئے تھے جو نسبتاً بڑا تھا۔ صحن میں دو تین گھنے سایہ دار درخت بھی استادہ تھے۔

میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد وہاں موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ کانسٹیبل مراد علی کو میں نے لاشوں کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا اور اب جو بھی کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔

میں نے دو تین افراد کو ٹٹول کر دیکھا لیکن ان کی زبانوں سے کام کی کوئی بات نکل نہ سکی۔ اس کے بعد میں بشیر لوہار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ شخص مقتولین کا پڑوسی تھا اور اس واقعے کی اطلاع لے کر میرے پاس پہنچا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بشیر! تمہارے خیال میں اس واردات کا ذمے دار کون ہو سکتا ہے؟"

"جناب! میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تم ان کے پڑوسی ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اتنا بے خبر تو نہیں ہونا چاہیے؟"

"آپ غلط نہیں کہہ رہے تھانیدار صاحب!" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "میں ان کا پڑوسی ہوں اور ان کے حالات کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں لیکن قتل کی اس واردات کے حوالے سے مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ آپ یقین کریں، میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں نے فی الحال تمہاری بات کا یقین کر لیا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب یہ بتاؤ، اس واردات کا سب سے پہلا شاہد کون تھا؟"

اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میری بات کا آخری حصہ شاید اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔ میں نے فوراً وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ان دونوں بھائیوں کی لاشوں کو سب سے پہلے کس نے دیکھا تھا؟"

"منظور موچی نے!" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "منظور باڑو والی گلی سے گزر رہا تھا کہ باڑے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے اس کی نظر اندر صحن میں چلی گئی جہاں بچھی چارپائیوں پر یہ دونوں بھائی خون میں لت پت پڑے تھے....." اس نے تھوڑا توقف کر کے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میری دکان گھر کے اندر ہی، سامنے والے حصے میں ہے اور سارا گاؤں جانتا ہے کہ میں صبح سویرے اپنی دکان پر بیٹھ کر کام شروع کر دیتا ہوں۔ میرا اور مقتولین کا گھر ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور میری دکان کے دروازے اور ان کے گھر کے دروازے میں چند فٹ کا ہی فاصلہ ہے۔ ان کے گھر میں داخل ہونے والا ہر شخص میری نظر میں رہتا ہے۔ منظور موچی نے باڑے والا خونیں منظر دیکھ کر مقتولین کے گھر کی طرف دوڑ لگائی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا، میری اس پر نگاہ پڑ گئی۔ میں نے اسے بڑی پریشانی کے عالم میں دیکھا۔ یہ سب مجھے بڑا عجیب لگا اور میں نے بے ساختہ اسے آواز دی۔

"او منظورے! خیریت تو ہے.....؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر تیزی سے میری دکان میں داخل ہو کر بولا۔ "خیریت نہیں ہے بشیرے.....!"

اس کی خوف زدگی کو دیکھتے ہوئے میں نے کام سے ہاتھ کھینچ لیا اور پوچھا۔ "پر ہوا کیا ہے۔ کچھ منہ سے تو بول؟"

"پیچھے باڑے میں دو لاشیں..... پڑی ہیں!" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "م..... میرا خیال ہے، فیاض اور ریاض کو کسی نے قتل کر دیا ہے.....!"

"اوہ.....!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "تم اسی واقعے کی اطلاع دینے ادھر آئے ہو؟"

"ہاں....." اس نے میکانکی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ "میں ان کی ماں کو بتانا چاہتا تھا کہ تم نے آواز دے دی..."

میں دکان سے فوراً باہر آ گیا۔ جس دوران میں منظورا، مقتولین کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، میں نے باڑے میں جا کر اس کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق اپنی آنکھوں سے کر لی۔ فیاض اور ریاض کی خون آلود لاشیں بے حس و حرکت چارپائیوں پر پڑی تھیں۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا، ایک گہری

سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''تھانیدار صاحب! اس دہرے قتل کا لرزہ خیز منظر دیکھ کر میں واپس آیا تو منظور دروازے پر کھڑا زاہدہ کو اس واقعے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے بعد تو گویا ایک کہرام مچ گیا۔ زاہدہ اپنا دوپٹا سنبھالتے ہوئے ہم دونوں کے ساتھ باڑے میں پہنچی اور اپنی آنکھوں سے فیاض اور ریاض کی کٹی پھٹی خون آلود لاشیں دیکھیں۔ اس منظر نے اسے بے قابو کردیا اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی......''

وہ اتنا بتانے کے بعد پھر رکا، گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جناب! پھر تو اس واقعے کی خبر پورے شمشیر پور میں پھیل گئی۔ فوری طور پر فیصلہ کیا گیا کہ سب سے پہلے تھانے میں اطلاع دینا چاہیے چنانچہ میں نے صدیق کوچوان کو تیار کیا اور ہم اصغر کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ گئے۔ یہ ہے کل کہانی جناب!''

''کافی سنسنی خیز کہانی ہے......!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر وہاں پر موجود افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بشیر لوہار سے پوچھا۔ ''کیا منظور موچی ان لوگوں میں شامل ہے؟''

''نہیں جناب......'' اس نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس وقت کہیں نظر نہیں آرہا۔''

''وہ ہوگا تو گاؤں کے اندر ہی نا؟''

''جی ہاں......اسے کہاں جانا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں مقتولین کی والدہ کے پاس جارہا ہوں۔ تم منظور موچی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے پاس لے آؤ۔''

''بہت بہتر جناب!'' اس نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے گھر میں کوئی فالتو تالا پڑا ہوا ہے؟''

''جی...... تالا مل جائے گا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''جاؤ، بھاگ کر جلدی سے وہ تالا لے آؤ......چابی بھی ساتھ لانا۔''

''ابھی گیا...... اور ابھی آیا سرکار۔'' یہ کہتے ہی وہ رخصت ہوگیا۔

اس باڑے میں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، دو دروازے تھے۔ ایک وہ بڑا دروازہ جس میں سے ہم اندر داخل ہوئے تھے اور دوسرا چھوٹا دروازہ جو باڑے کی عقبی دیوار میں تھا۔ یہ چھوٹا دروازہ اندرونی جانب سے بند تھا اور اس پر تالا بھی لگا ہوا تھا۔ بشیر لوہار سے میں نے جو تالا منگوایا تھا اسے میں بڑے دروازے پر لگانا چاہتا تھا تاکہ جائے وقوعہ کو محفوظ کیا جاسکے۔ یہ کچھ اس نوعیت کی واردات تھی کہ عین ممکن تھا، قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے باقاعدہ کھرا اٹھوانا پڑتا اور......اس کام کا نقطۂ آغاز یہ باڑا ہی تھا!

تھوڑی ہی دیر کے بعد بشیر لوہار تالا اور چابی لے کر آگیا۔ میں نے باڑے کا بڑا دروازہ باہر سے بند کیا، اس کی کنڈی چڑھا کر تالا لگایا اور خود زاہدہ پروین سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے وقتی طور پر، باڑے کو لوگوں کی آمد و شد سے محفوظ رکھنے کے لیے بشیر کا تالا لگادیا تھا لیکن بعد ازاں پہلی فرصت میں مجھے وہاں سرکاری تالا ڈالنا تھا۔ یہ ساری کارروائی زاہدہ سے ملاقات کے بعد ہی ممکن تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، اس ملاقات کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ اس ملاقات سے کچھ ایسے اشارے مل جائیں کہ کسی کھوجی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

دونوں لاشوں کی حالت چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کررہی تھی کہ یہ واردات ایک سنگین انتقامی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ ان دونوں بھائیوں کے لیے اپنے دل و دماغ میں نفرت کا بڑا ذخیرہ رکھتا تھا۔ اس تناظر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ زاہدہ، اپنے بیٹوں کے کسی ایسے دشمن سے واقف نہ ہو جو اس حد تک چلا گیا تھا۔

☆☆☆

زاہدہ پروین کو دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ پینتالیس پچاس کے پیٹے میں ہوگی لیکن وہ کسی بھی طور تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنی حیرت کو فی الحال ظاہر نہیں ہونے دیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''زاہدہ! مجھے اس ہولناک واقعے کا گہرا دکھ ہے اور میں تمہارے رنج میں برابر کا شریک ہوں۔ تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد تمہارے بیٹوں کے قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا......!''

اس وقت ہم دونوں زاہدہ کے گھر کے اندر ایک کمرے میں بیٹھے تھے اور اس کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس واقعے کی خبر عام ہونے کے بعد زاہدہ کا گھر گاؤں کی عورتوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب اس سے ہمدردی اور تعزیت کے لیے آئی تھیں۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو اس وقت بھی وہاں چار پانچ عورتیں موجود تھیں اسی لیے پوچھ گچھ کی خاطر میں زاہدہ کو الگ کمرے میں لے کر

بیٹھ گیا تھا۔ زاہدہ کا تین سالہ بچہ فرمان علی بھی انہی عورتوں نے سنبھال رکھا تھا۔

وہ میرے اظہار ہمدردی کے جواب میں بولی۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ فیاض اور ریاض کا قاتل جتنی جلدی ممکن ہوسکے، جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے۔''

''میں یہ کرسکتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

''بتائیں...... میں آپ سے کیا تعاون کروں؟'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے ایک انجانی سی سرد مہری محسوس ہوئی۔ اس کے دو بیٹوں کو بڑے بہیمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس اندوہناک موقع پر ایک ماں کا جو فطری ردِعمل ہونا چاہیے تھا وہ مجھے زاہدہ کے انداز و تاثرات میں کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رو رہی تھی، پریشانی اور دکھ کا اظہار کررہی تھی، رنجیدہ اور دکھی نظر آنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں موت کا دیا ہوا داغ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ آنکھیں کرب اور اذیت کے مفہوم سے خالی تھیں۔

''تمہارے تعاون کے بغیر میرے لیے ایک قدم بھی اٹھانا ممکن نہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ گی کہ ان دونوں بھائیوں کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''اگر مجھے قاتل کا پتا ہوتا تو میں جا کر اسے گردن سے نہ پکڑ لیتی۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ بھی عجیب بات کررہے ہیں تھانیدار صاحب!''

''میں نے کوئی عجیب بات نہیں کی ہے زاہدہ۔'' میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اس وقت دکھی اور پریشان ہو اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہے ورنہ میں تو......''

میں ایک لمحے کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں بھائیوں کی کس کس سے دشمنی تھی؟''

میرا سوال سن کر زاہدہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے کوئی واضح جواب دینا چاہ رہی ہو لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ دونوں تو بہت ہی نیک اور شریف تھے۔ کوئی ان سے دشمنی کیوں کرے گا مگر......!''

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''زاہدہ بی بی! انہیں جس بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے، یہ کام کسی دوست کا نہیں ہوسکتا۔ صاف ظاہر ہورہا ہے کہ قاتل ان دونوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ وہ کتنے ہی نیک اور شریف کیوں نہ ہوں، کوئی نہ کوئی ان کا دشمن ضرور ہوگا۔ انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں وہاں انہی دوستوں کے اندر یا باہر ایک آدھ دشمن بھی موجود ہوتا ہے۔ اور یہ جو تم......!'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جو بولتے بولتے اچانک رک گئی ہو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اس واردات کے حوالے سے کوئی ایسی بات ضرور جانتی ہو جو مجھے فیاض اور ریاض کے قاتل تک پہنچا سکتی ہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتی ہو کہ ان کے قاتل کو عبرتناک سزا ہو؟''

''میں نے بتایا ہے نا، میری شدت سے یہ خواہش ہے کہ ان کا قاتل جلد از جلد پھانسی لگ جائے۔'' وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ''آپ میری کسی بات کا غلط مطلب نہ نکالیں۔ کیا ہوا جو میں ان کی سگی ماں نہیں ہوں......!''

زاہدہ پروین کے آخری جملے نے میرے ذہن میں ابھرنے والے بہت سے سوالات کا منہ بند کردیا۔ میں نے ہمدردی بھرے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''زاہدہ! تمہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ تم ایک خوبصورت اور جوان عورت ہو۔ میرے اندازے کے مطابق، تم زیادہ سے زیادہ تیس سال کی ہوگی۔ ایک تیس سالہ عورت کے بیٹے انیس اور بائیس سال کے تو نہیں ہوسکتے نا!''

آخری جملہ میں نے اس کی زبان رواں کرنے کے لیے ادا کیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''میں اس وقت اٹھائیس سال کی ہوں۔ میں فیاض اور ریاض کی سوتیلی ماں ہوں۔ فتح محمد نے پانچ سال پہلے مجھ سے شادی کی تھی لیکن افسوس کے پچھلے سال وہ میرا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم دونوں کی نشانی فرمان علی ہے......''

اتنا بتا کر اس نے افسردہ انداز میں گردن جھکالی۔ مجھے اگر اس کی آنکھوں میں اپنے لختِ جگر کی ابدی جدائی کا غم نظر نہیں آیا تھا تو اس کا یہی سبب تھا کہ فیاض اور ریاض نے اس کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا جبھی زاہدہ کی سوگواری میں وہ تڑپ نظر نہیں آتی تھی۔

زاہدہ اٹھائیس سال کی ایک بھرپور اور جوان عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ بھرے بھرے بدن کی مالک ایک پرکشش عورت تھی۔ فتح محمد نے اگر بڑھاپے میں اس سے شادی کی تھی اور ایک بچے کا باپ بھی

بن گیا تھا تو اس کا سبب، زاہدہ کے حسن اور جوبن کی شکل میں نظر آتا تھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ زاہدہ کو بوڑھے فتح محمد میں کیا دکھائی دیا تھا۔

میں نے زاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''فیاض اور ریاض تمہارے سگے بیٹے تھے یا سوتیلے، اس سے قطعی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں کہ ان کی المناک موت نے تمہیں توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں تمہارے دکھ اور تکلیف کو سمجھ سکتا ہوں زاہدہ!''

''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ گردن اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں چونکہ تمہارے دکھ درد کو سمجھ رہا ہوں اسی لیے چاہتا ہوں کہ فیاض اور ریاض کے قاتل کو قرار واقعی سزا ملے۔ مجھے امید ہے، اگر تم مجھ سے مناسب تعاون کرو تو یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے ان کے دشمن کے حوالے سے جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے تو......؟''

''وہ کوئی خاص بات نہیں تھی......'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''بات خاص تھی یا عام، تم اس فکر میں نہ پڑو۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بعض اوقات ایک معمولی اور غیر اہم بات بھی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ۔ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔''

چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''تھانیدار جی! دراصل، میرا دھیان صفدر کی طرف جا رہا تھا۔''

''صفدر......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ صفدر کون ہے؟''

''صفدر اسی گاؤں میں رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''فضول اور آوارہ گرد انسان ہے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

''ٹھیک ہے، یہ صفدر بہت ہی بے کار شخص ہوگا۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن فیاض اور ریاض کے قتل کے سلسلے میں تمہارا دھیان صفدر کی طرف کیوں چلا گیا۔ اس کا مقتولین سے کیا تعلق ہے؟''

مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ زاہدہ کی زبان سے کوئی ایسا انکشاف ہونے والا ہے جو مجھے دونوں بھائیوں کے قاتل تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔ میں پوری توجہ سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''وہ جی...... پچھلے دنوں صفدر کا ان دونوں بھائیوں سے اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''جھگڑا......!'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟''

''میرا خیال ہے، میں آپ کو کھل کر بتاتی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''ہاں ہاں، میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا۔ ''جب تک تم کھل کر نہیں بولو گی، بات بن نہیں سکے گی اور میں بھی خوامخواہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہوں گا۔''

''تھانیدار جی!'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ ''دراصل، صفدر اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ کوئی باقاعدہ کام دھندا نہیں کرتا۔ تھوڑی بہت بدمعاشی اور غنڈا گردی یا کہیں چھوٹا موٹا کام مل گیا تو کر لیا۔ اس کی بوڑھی ماں کریماں بی بی کو پوری طرح دکھائی بھی نہیں دیتا۔ وہ کسی کی مدد کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی۔ صفدر کی بہن نازو ہی بوڑھی ماں کا خیال رکھتی ہے اور......''

''یہ تو صفدر کے خانگی حالات ہیں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ مقتولین کا کس بات پر صفدر سے جھگڑا ہوا تھا؟''

''میں اسی طرف آ رہی ہوں تھانیدار جی!'' وہ بڑی رسان سے بولی۔ ''دراصل، صفدر کے خانگی حالات کا جائزہ لیے بغیر آپ جھگڑے کی وجہ کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکیں گے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے ابھی صفدر کی چھوٹی بہن نازو کا ذکر کیا ہے نا...... وہی سارے جھگڑے کی بنیاد ہے۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ سال ہوگی لیکن اللہ نے شکل صورت اچھی دی ہے، بلکہ بہت اچھی دی ہے اور اسی شکل صورت نے ریاض کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ وہ نازو پر مرمٹا تھا۔ اس کے بعد جو ہوتا ہے، وہ آپ بھی جانتے ہیں......''

وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوگئی۔ اس بار میں نے اسے روکنے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کہانی میں نازو کے کردار کو شامل کر کے میرے جذبۂ تجسس کو ہوا دے دی تھی لیکن میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا، اس کی زبان

سے کوئی نہایت ہی سنسنی خیز انکشاف ہونے والا ہے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''ریاض اور نازو نے چھپ چھپ کر ملنا شروع کردیا۔ کبھی کھیتوں میں، کبھی رات کی تاریکی میں، ٹیوب ویل کے پیچھے اور کبھی ذخیرے کے اندر (ذخیرے سے اس کی مراد گھنے درختوں کا وہ جھنڈ تھا جو شمشیر پور کے سرسبز کھیتوں سے جڑا ہوا تھا) آپ سمجھ دار ہیں، یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ چوری چھپے کی ان ملاقاتوں کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔''

اس نے توقف کرکے میری آنکھوں میں دیکھا اور مزید بتانے لگی۔ ''نازو اور ریاض کے درمیان جو کچھ چل رہا تھا وہ زیادہ عرصے تک چھپا نہ رہ سکا۔ ان کے تعلقات کی خبریں اڑ کر صفدر تک بھی پہنچیں اور اس غنڈے کا دماغ خراب ہوگیا۔ ایک روز اس نے ریاض کو گھیرلیا اور بغیر کوئی سوال کیے اسے مارنا شروع کردیا اور کسی کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن ریاض اچھی طرح جانتا تھا کہ صفدر اس سے کس بات پر جھگڑا کررہا ہے۔ اس سے پہلے کہ بات بہت زیادہ بڑھ جاتی، لوگوں نے بیچ میں پڑ کر انہیں جھگڑنے سے روک دیا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی اور اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اس جھگڑے کی خبر گھر تک بھی پہنچی تھی۔ مجھے اور فیاض کو اس معاملے کی سن گن تو تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ نوبت مار پیٹ تک جا پہنچے گی۔ جب ہمیں ان کے تعلقات کا پتا چلا تو ہم نے ریاض کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ نازو سے نہیں ملے گا۔ ہم مطمئن ہوگئے لیکن......'' اس نے پراسرار انداز میں رک کر مجھے دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ریاض نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا اور چوری چھپے نازو سے ملنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چند روز بعد، ریاض اور فیاض کھیتوں کی طرف جارہے تھے کہ صفدر اچانک ان کے سامنے آگیا۔ اس وقت صفدر کے ساتھ لاکھو بھی تھا۔ لاکھو کوئی اچھا آدمی نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے، وہ مختلف قسم کے جرائم میں ملوث رہتا ہے اور صفدر سے اس کی بڑی گاڑھی دوستی بھی ہے۔ لاکھو نے اس روز ریاض سے کہا۔

''اسے آخری وارننگ سمجھ لو۔ میں اپنے الفاظ دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ جو لوگ میری بات کو نہیں سمجھ پاتے انہیں میں پھر اپنے مخصوص طریقے سے سمجھاتا ہوں اور...... ایسا سمجھاتا ہوں کہ زندگی بھر اور زندگی کے بعد بھی وہ میرا نام سن کر تھرتھر کانپنے لگتے ہیں...... صفدر کی چھوٹی بہن نازو سے دور رہو......!''

''لیکن ریاض کا تو اب اس لڑکی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔'' فیاض نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ''ہم نے اسے سمجھا دیا ہے۔ شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''غلط فہمی!'' لاکھو ایک جھٹکے سے ریاض کی جانب مڑا اور زہریلے لہجے میں بولا۔

''اوئے بھونڈے عاشق کی اولاد! کیا تم پچھلی جمعرات کو نازو سے نہیں ملے تھے۔ ادھر کھڑی فصل میں...... بتاؤ اپنے بھائی کو کہ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی!''

کوئی جواب دینے کے بجائے ریاض نے گردن جھکالی جو اس بات کا اقرار تھا کہ لاکھو کے کہے کے مطابق، وہ پچھلی جمعرات کو نازو سے ملنے کھیتوں کی طرف گیا تھا۔ اس موقع پر فیاض نے اپنے بھائی کی حمایت لیتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''تم میرے بھائی کے پیچھے ہی ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہو۔ ذرا اپنے دوست صفدر کی بہن کو بھی تو سمجھاؤ...... وہ کیوں ریاض سے ملنے کے لیے آتی ہے؟''

''میرا خیال ہے......!'' لاکھو نے فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''ریاض کے ساتھ ساتھ، ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑنے کی بھی ضرورت ہے۔ تمہاری حمایت ہی نے اس لڑکے کا دماغ خراب کیا ہے......!''

لاکھو کے لہجے میں پوشیدہ سنگین دھمکی کو اس وقت فیاض سمجھ نہ سکا اور معاملہ رفع دفع کرکے وہ ریاض کو اپنے ساتھ گھر لے آیا اور پھر...... چند روز بعد ہی یہ واقعہ پیش آگیا۔''

زاہدہ پروین نے دکھی انداز میں بات ختم کی اور امید افزا نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''زاہدہ! تم نے جو کہانی سنائی ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی موت میں صفدر یا لاکھو کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں ان دونوں بندوں کو اچھی طرح ''چیک'' کروں گا۔ صفدر تو شمشیر پور ہی کا رہنے والا ہے۔ کیا لاکھو بھی......!''

''نہیں جی......!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''لاکھو کا تعلق چنیاں والی سے ہے جو ہمارے گاؤں سے دو میل دور مغرب میں واقع ہے۔ وہ صفدر سے ملنے یہاں آتا رہتا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو زاہدہ!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں

کہا۔ ''اس واردات میں صفدر اور لاکھو ملوث ہیں یا کوئی اور شخص، میں قاتل کی تلاش میں مغرب مشرق و شمال جنوب ہر سمت میں جاؤں گا......'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بس، تم میرے ایک دو سوالات کے جواب مزید دے دو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا تاکہ جلد از جلد قاتل کی تلاش کا کام شروع کرسکوں۔''

''جی پوچھیں...... میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی اور متوقع نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں زاہدہ سے کوئی سوال کرتا، رے کے باہر کسی بچے کے رونے کی آواز ابھری۔ زاہدہ نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا جو بھڑا ہوا تھا۔ اس کی کاہ دروازے سے پلٹ کر میری طرف آئی پھر اضطراری لہجے ں اس نے کہا۔

''میرا فرمان رو رہا ہے۔ اس کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں دس پندرہ منٹ میں اسے کچھ کھلا پلا کر واپس آجاتی ہوں؟''

کسی ماں کو، اس کے روتے بلکتے بچے کے پاس جانے سے نہیں روکا جاسکتا اور خاص طور پر ان لمحات میں جب بچہ کچھ کھانے کی طلب محسوس کر کے بھوک سے رو رہا ہو، لہٰذا میں نے زاہدہ کو کمرے سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔

ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ زاہدہ نے نازو کے حوالے سے صفدر اور لاکھو کے غم و غصے اور دھمکیلے انداز کی جو تفصیل بیان کی تھی اس کی روشنی میں تو ذہن کی آنکھ انہی دو غنڈا عناصر کو دیکھنے پر مجبور تھی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوتی کہ صفدر یا لاکھو نے...... یا ان دونوں نے مل کر ریاض اور فیاض کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو!

میں نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور انہیں دیکھ کر یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ دورانِ قتل انہوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اپنی جان ہر انسان کو پیاری ہوتی ہے۔ ریاض اور فیاض کا ردِعمل سمجھ سے بالاتر تھا جو اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا تھا کہ جب ان پر کلہاڑیاں برسائی جارہی تھیں تو وہ دونوں ہوش وحواس سے بے گانہ تھے اور یہ ''بے گانگی'' عارضی بھی ہوسکتی تھی اور مستقل بھی!

تھوڑی دیر کے بعد زاہدہ اپنے بیٹے فرمان علی کو کھلا پلا کر واپس میرے پاس آگئی۔ باہر سے اب فرمان کے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ماں کی گود کی مخصوص حرارت میں شکم سیر ہونے کے بعد پرسکون ہوگیا ہے۔ میں نے زاہدہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''زاہدہ! دن چاہے کیسا بھی کیوں نہ ہو لیکن رات میں آج کل اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور کچھ اوڑھے بغیر سونا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ ایسے موسم میں وہ دونوں بھائی باڑے میں جاکر کیوں سوئے تھے اور وہ بھی کھلے آسمان میں...... اس طرح کہ انہوں نے کچھ اوڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی؟''

اس نے تحمل سے میری بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''پہلی بات تو یہ کہ وہ بغیر کچھ اوڑھے باڑے میں نہیں سوتے تھے۔ ان کی چارپائیوں پر سرہانوں کے علاوہ کھیس بھی رکھے ہوتے تھے اور جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو......'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار جی! آج کل شمشیر پور میں ڈھور ڈنگر کی چوری کے بڑے واقعات پیش آرہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، ادھر باڑے میں ہمارے اچھے خاصے مویشی بندھے ہوئے ہیں۔ پچھلے چند روز سے ریاض اور فیاض اپنے مال ڈنگر کی حفاظت کے لیے ادھر ہی سو رہے تھے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے زاہدہ!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''لیکن جائے وقوعہ سے کھیس تو نہیں ملے۔ یہ حیرت والی بات نہیں کہ قاتل جاتے ہوئے ان کے کھیس بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے؟''

''بات تو واقعی بہت عجیب ہے جناب!'' وہ ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے، ان کی چارپائیوں پر کھیس رکھے تھے۔ میں ہی شام کے وقت ان کی چارپائیاں اور بستر وغیرہ بچھاتی ہوں اور پچھلی رات بھی میں نے ان کی چارپائیوں پر تکیے اور کھیس رکھے تھے۔ دونوں کھیس کیسے غائب ہوگئے، یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہی جی۔''

اس کے بعد وہ گمشدہ کھیسوں کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگی۔ زاہدہ کے مطابق، ان میں سے ایک کھیس چٹا سفید تھا جس کے دونوں سروں پر سرخ بارڈر بنا ہوا تھا جبکہ دوسرا کھیس کریم کلر کا تھا اور اس کا بارڈر ہرے رنگ کا تھا۔ زاہدہ

نے مجھے بتایا کہ جب صبح، اطلاع ملنے پر وہ باڑے کی طرف گئی تو واقعی بستروں پر کھیس موجود نہیں تھے لہٰذا اس نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کو ڈھانپنے کے لیے گھر سے دو چادریں لادی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ! رات کو سونے سے پہلے وہ دونوں باڑے کے بڑے دروازے کو اندر سے بند تو کرلیا کرتے تھے نا؟''

''ظاہر ہے جی، ورنہ پھر پہرے داری کا کیا فائدہ!'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''آج صبح باڑے کا بڑا دروازہ کھلا پایا گیا تھا جبھی منظور موچی نے گلی میں سے گزرتے ہوئے باڑے کے اندر وہ خونچکاں منظر دیکھ لیا۔ منظورے سے یہ بات بشیر لوہار تک پہنچی اور پھر انہوں نے اس واقعے کے بارے میں تمہیں بتایا۔ اس کا مطلب ہے......'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ قاتل خالصتاً ان دونوں بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی نیت سے وہاں پہنچا تھا۔ اگر وہ کوئی ڈنگر چور ہوتا تو باڑے سے مویشی غائب ہوجاتے اور وہ دونوں بھائی محفوظ رہتے۔ باڑے کی دیوار زیادہ اونچی نہیں۔ قاتل دیوار پھلانگ کر اندر آیا ہوگا اور ان کا کام تمام کرکے واپس چلا گیا۔ واپسی میں اس نے باڑے کا بڑا دروازہ استعمال کیا اور جاتے ہوئے وہ دروازے کو کھلا چھوڑ گیا......!''

''ہاں جی، محسوس تو ایسا ہی ہورہا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی!''

''وہ کیا جی؟'' وہ جلدی سے مستفسر ہوئی۔

میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ! جب کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہوتا ہے تو وہ آسانی سے جان دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی زندگی، اپنی جان بچانے کے لیے ہر قسم کی مزاحمت اور کوشش کرتا ہے، خاص طور پر جب حملہ آور کلہاڑی سے وار کررہا ہو لیکن ان دونوں بھائیوں کی لاشیں جتنے 'صبر وسکون' سے پڑی ملی ہیں اس سے تو ظاہر ہوتا ہے انہوں نے قاتل کی منشا کے سامنے اف تک نہیں کی۔ اس صورتِ حال میں میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچنے پر مجبور ہے......!''

میں لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا تو زاہدہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''تھانیدار جی! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''میرے اندازے کے مطابق......!'' میں نے بدستور پرخیال انداز میں کہا۔ ''جس وقت قاتل ان دونوں بھائیوں پر کلہاڑی کے وار کررہا تھا تو وہ بے چارے کسی مزاحمت کے قابل ہی نہیں تھے۔''

''جی......کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سیدھا اور سادہ مطلب یہ ہے کہ ان لمحات میں ریاض اور فیاض کسی شے کے زیراثر دنیا ومافیہا سے بے خبر تھے، وہ آخری درجے پر انٹا غفیل ہوچکے تھے۔''

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے جی؟'' اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ تو مجھے تم ہی بتاؤ گی؟''

میرا سوال سن کر وہ گھبرا گئی پھر بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''مم...... مجھے کیا پتا جی......''

میں چند لمحات تک گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے استفسار نے اسے اچھا خاصا بے چین کردیا تھا۔ اس بے چینی میں پریشانی بھی شامل تھی۔ دراصل، لوگ پولیس کا سامنا کرتے ہوئے اکثر گھبرا جاتے ہیں اور کسی قتل کیس میں جب ان سے پوچھ گچھ کی جارہی ہو تو ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ میں نے بھی زاہدہ پروین کی موجودہ کیفیت کو اسی خانے میں فٹ کیا اور ذرا گھما پھرا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''زاہدہ!'' میں نے متحمل لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ، رات کو وہ کتنے بجے تک باڑے میں سونے کے لیے چلے جایا کرتے تھے؟''

''یہی......کوئی نو بجے جی۔'' اس نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔

''اور صبح ان کی واپسی کتنے بجے ہوتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل تڑکے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''وہی واپس آکر مجھے جگایا کرتے تھے۔ آج اسی لیے میں دیر تک سوتی رہی کہ وہ اپنے وقت پر واپس نہیں آئے...... پھر دوسرے لوگوں نے دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے جگایا اور یہ خبر بھی دی کہ''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور دل گرفتہ انداز میں چپ ہوگئی۔

میں اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا لیکن میں نے خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ جب اس کی حالت قدرے

سنبھل گئی تو میں نے سوال کیا۔

''زاہدہ! کیا پچھلی رات بھی وہ نو بجے ہی سونے کے لیے باڑے میں گئے تھے؟''

''جی، جی ہاں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ دونوں شام سے تھوڑی دیر پہلے کھیتوں سے واپس آجایا کرتے تھے۔ سب سے پہلے وہ بھینسوں کا دودھ نکالتے پھر تمام مویشیوں کو چارا وغیرہ کھلاتے اور اس کے بعد گھر کے اندر آجایا کرتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد، ہم سب میں تھوڑی بات چیت ہوتی اور لگ بھگ نو بجے وہ باڑے کی طرف چلے جاتے تھے۔''

''آپ لوگوں کی زمین کتنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دس کلے جناب۔''

''اس دس ایکڑ زمین پر وہ دونوں خود ہی کاشت کاری کرتے تھے یا انہوں نے اپنی مدد کے لیے کوئی ملازم وغیرہ بھی رکھا ہوا تھا؟''

''نہیں جی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''کھیتی باڑی کا سارا کام وہ خود ہی کیا کرتے تھے۔''

''تم نے رات کو کھانے میں کیا پکایا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دونوں بھائیوں کو 'کڑی چاول' بہت پسند تھے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''میں نے رات کو چاٹی والی لسی کی کڑی اور باسمتی کے چاول بنائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کھیر بھی تھی۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھایا اور پھر سونے کے لیے چلے گئے تھے......!''

''کیا رات والے کھانے کا کچھ حصہ بچا ہوا ہے؟'' میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''کیوں جی!'' وہ متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس کا کیا کریں گے؟''

''کرنا کیا ہے زاہدہ......!'' میں نے بدستور عام سے لہجے میں کہا۔ ''دراصل، کڑی چاول اور کھیر مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ سوچا تھا، تمہارے ہاتھ کا ذائقہ بھی چکھ لوں گا۔ ویسے بھی دن کے کھانے کا وقت ہے!''

موقع محل اور صورتِ حال کے پیشِ نظر میرے یہ خواہش اور پسندیدگی بھرے الفاظ انتہائی نامناسب تھے۔ ابھی ابھی اس گھر سے دو لاشیں اٹھا کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوائی گئی تھیں اور میں مقتولین کی ماں سے دوپہر کے کھانے کی بات کر رہا تھا۔ دراصل، یہ سب کچھ میں ایک خاص مقصد کی خاطر کر رہا تھا۔ عقل مند قارئین کا ذہن یقیناً میرے اس مقصد تک پہنچ گیا ہوگا۔

چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''اب تو جناب، کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ میں نے رات ہی کو ہنڈیا اور پتیلے دھو کر رکھ دیے تھے۔ ان دونوں کو کھانا اتنا پسند آیا تھا کہ وہ ایک پلیٹ ختم کرتے تو دوسری مانگتے......!''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکی تھی۔ دراصل، میں اس کھانے کا لیبارٹری ٹیسٹ کروانا چاہتا تھا جسے کھا کر وہ دونوں ایسی غفلت کی نیند سوئے تھے کہ انہیں اپنے ''اناللہ'' ہونے کی بھی مطلق خبر نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے زاہدہ سے پوچھا۔ ''کیا تم اس گاؤں میں اکیلی ہی رہتی ہو۔ تمہارے عزیز رشتے دار مجھے نظر نہیں آئے۔ باہر اور دوسرے کمروں میں جو عورتیں موجود ہیں وہ تمہاری رشتے دار تو نہیں لگتیں!''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ گاؤں کیا، اس سے باہر بھی دور دور تک میرا کوئی رشتے دار موجود نہیں......بس، میرا ایک تایا کا بیٹا ہے جو ادھر جلال نگر میں رہتا ہے۔ میں نے اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے ایک بندے کو جلال نگر بھیجا تو ہے۔ اب دیکھیں، سلطان کب تک یہاں پہنچتا ہے!''

''سلطان تمہارے تایا زاد کا نام ہے؟'' میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے مزید پندرہ منٹ اس کے پاس گزار کر اسے مختلف ہدایات دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس عظیم سانحے پر اسے تسلی تشفی بھی دی۔ وہ اس ہمدردانہ رویے پر بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ بہت جلد ریاض اور فیاض کے قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا اور اس دوران میں اگر اسے کوئی اہم بات پتا چلے تو وہ فوراً مجھے بتائے۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایت کو ذہن میں رکھے گی۔

☆☆☆☆

میں زاہدہ کے گھر سے نکلا تو بشیر لوہار سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنی دکان کے سامنے کھڑا ایک ضعیف شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری جانب بڑھا اور اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! یہ اپنا منظورا ہے جی......منظور موچی!''

''اوہ......!'' میں بے ساختہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

منظور موچی کی عمر ساٹھ سے متجاوز دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے تمام تر بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک پستہ قامت اور اکہرے بدن کا مالک تھا۔ منظور نے سر پر ہلکی پھلکی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے سب سے پہلے ریاض اور فیاض کی کٹی پھٹی لاشوں کو باڑے کے اندر چارپائیوں پر پڑے دیکھا تھا۔ میں منظور موچی کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں، چاچا منظورے! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ آج صبح تم نے باڑے کے اندر کیا دیکھا تھا؟''

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتانا شروع کیا کہ وہ صبح اس گلی سے گزرا تو باڑے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے اس نے ایک خونچکاں منظر دیکھا۔ وہ روزانہ صبح ادھر سے گزر کر کھیتوں کی جانب جایا کرتا تھا لیکن پہلے جب بھی وہ باڑے کے قریب سے گزرا تو اس نے سب کچھ نارمل پایا۔ دروازہ تو کھلا ہوا ہی کرتا تھا مگر وہ دونوں بھائی سوئے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے اور سوئے ہوئے بھی ایسے کہ..... خدا کی پناہ!

وہ یہاں تک بتانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں خوف زدگی کے آثار واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک جھرجھری بھی لی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''چاچا! کیا تمہیں پتا تھا کہ ریاض اور فیاض آج کل باڑے کے اندر سو رہے ہیں؟''

''جی سرکار! یہ بات تو پورے پنڈ کو پتا ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج کل اس علاقے میں ڈنگروں کی چوری کی بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔ جس کسی نے بھی مال مویشی پال رکھے ہیں' وہ ان کی حفاظت کے لیے پریشان ہے..... آپ اس علاقے کے تھانیدار ہیں۔ آپ کو تو سب پتا ہی ہے جناب۔''

یہ سچ ہے کہ مویشیوں کی چوری کے اِکّا دُکّا واقعات پیش آئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے ''مویشی چوری'' کا سیزن ہی سمجھ لیا جائے۔ بہرحال، گاؤں دیہات میں کسی بھی ناخوشگوار واقعے کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ میں نے منظور موچی کی بات کے جواب میں کہا۔

''ہاں چاچا، سارے حالات میرے علم میں ہیں۔ میں جانتا ہوں، حالات اتنے خراب نہیں ہیں جتنا خوف وہراس لوگوں میں پایا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں، موضع شمشیر پور میں تو ابھی تک ایک مرغی بھی چوری نہیں ہوئی۔ خیر..... !'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''چاچا! تم نے باڑے کے اندر دونوں بھائیوں کی خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں دیکھیں اور زاہدہ کو اس واقعے کے بارے میں بتانے کے لیے ادھر آئے اور بشیر سے تمہاری ملاقات ہوئی۔ تم دونوں نے زاہدہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، جائے وقوعہ پر تمہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی۔ مثلاً کوئی بھی ایسی شے جسے دیکھ کر تم چونک اٹھے ہو؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!'' وہ آنکھیں سکیڑ کر بولا۔ ''اس سے زیادہ غیر معمولی اور اہم بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ دو جوان بھائیوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا؟''

''میں تو کہتا ہوں، اس گھر کو کسی کی نظر کھا گئی ہے۔'' بشیر لوہار نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی ایک سال پہلے ہی ان کا باپ فتح محمد خون تھوکتا ہوا مرا ہے اور اب یہ دونوں خون میں لت پت۔ پتا نہیں، خون کا یہ بہاؤ آگے چل کر کیا کیا تماشے دکھائے گا!''

خون تھوک کر واقع ہونے والی موت کو عموماً ٹی بی کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔ آج کل تو اس مرض کا بڑا آسان علاج دریافت ہو چکا ہے لیکن اُس زمانے میں اس موذی مرض کو بڑا ہی خطرناک اور ناقابلِ علاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ ''ٹی بی'' درحقیقت موت ہی کا دوسرا نام تھا جو یک دم نہیں بلکہ دھیرے دھیرے آتی تھی۔

میں یہ تو جانتا تھا کہ کوئی سال بھر پہلے فتح محمد کا انتقال ہو گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی موت کا سبب کیا رہا تھا۔ میں نے بشیر لوہار کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا فتح محمد کو ٹی بی کا مرض لاحق تھا؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں تھی جناب!''

''تم نے بتایا ہے نا، وہ خون تھوکتا ہوا مرا ہے۔'' میں نے استفسار کیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''وہ جناب..... بات دراصل یہ ہے کہ.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''فتح محمد کو کوئی ٹی بی، شی بی نہیں تھی۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی وہ اچھا خاصا صحت مند تھا۔ ٹی بی کا مریض تو آپ جانتے ہیں، صحت کے کون کون سے مسائل کا شکار رہتا ہے۔ خون تھوکنے کا مرحلہ تو بہت بعد میں آتا ہے، پہلے اس کی صحت کا کباڑا ہوتا ہے۔ چہرے پر مردنی

چھائی رہتی ہے، جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے......''
وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''فتح محمد کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو ''ساٹھا پاٹھا'' کی مثال تھا جناب! یہی دیکھیں نا، پانچ چھ سال پہلے اس نے زاہدہ سے شادی کی اور پھر اگلے ہی سال ایک بیٹے کا باپ بھی بن گیا۔ ٹی بی کے مریض میں اتنی ہمت اور جرات کہاں ہوتی ہے۔ یہ مرض تو سب سے پہلے مریض کے اعتماد پر حملہ آور ہوتا ہے، اسے اپنی ذات پر بھی بھروسا نہیں رہتا۔ کجا یہ کہ......!''
''یہ سب تو ٹھیک ہے بشیرے!'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''مجھے یقین آگیا کہ تم نے ٹی بی پر بڑی ریسرچ کر رکھی ہے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ فتح محمد کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟''
''ٹی بی پر ریسرچ کرنے والی بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی ہے جناب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''دراصل، میرے خاندان میں دو تین اموات اس مرض کی وجہ سے ہو چکی ہیں جن میں ایک تو میرے والد صاحب تھے۔ مجھے اس مرض کے مریض کو بہت قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور برتنے کا موقع ملا ہے اور جہاں تک فتح محمد کی موت کا تعلق ہے......!''
وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''رات کو اچھا خاصا سویا تھا۔ آدھی رات کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بس...... کھانستا چلا گیا۔ دونوں بیٹے اور زاہدہ پریشان ہو گئے۔ ریاض میرے پاس آیا اور باپ کی کیفیت کے بارے میں بتایا۔ یہ لوگ میرے پڑوسی ہیں۔ میں فوراً ان کے ساتھ ہولیا۔ فتح محمد کے پاس پہنچا تو اسے عجیب حالت میں پایا۔ وہ پیٹ کی تکلیف سے دُہرا ہوا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دردِ قولنج میں جتلا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے کچھ سوچ پاتا، اس نے خون کی الٹی کر دی...... پھر ایک اور الٹی...... خون اس کے منہ سے ایسے جاری تھا جیسے اس کے پیٹ کا کوئی پھوڑا پھٹ گیا ہو یا جیسے کسی نے اسے اندر سے ذبح کر دیا ہو......'' وہ دل شکستہ انداز میں متوقف ہوا پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔
''پھر اس نے دم دے دیا...... وہ خون تھوکتا تھوکتا مر گیا......!''
''مجھے تو یہ کوئی کالے علم کا چکر لگتا ہے بشیرے!'' منظور موچی نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی میں نے یہی کہا تھا۔ اس دنیا میں بعض لوگ بڑے ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے انسانوں سے دشمنی نکالنے کے لیے کالے، پیلے ہر قسم کے علم کا سہارا لیتے ہیں اور پھر کالا جادو تو ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا نا!''
''میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گا منظورے۔'' بشیر لوہار نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ فتح محمد کا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ایک بھلا مانس اور شریف آدمی تھا۔''
وہ دونوں فتح محمد کی موت پر، اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس وقت میرے ذہن میں فتح محمد نہیں بلکہ اس کے دو جوان بیٹوں کی المناک موت کے مناظر چل رہے تھے اور ان کے قاتل کے سلسلے میں ابھی تک کوئی اشارہ نہیں مل سکا تھا۔ زاہدہ نے نازو اور صفدر کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا وہ بہت اہم تھا لہٰذا میں نے اس معاملے کی تصدیق کے لیے بشیر لوہار سے پوچھ لیا۔
''میں نے سنا ہے، ریاض کا کسی نازو نامی لڑکی سے کوئی چکر بھی چل رہا تھا؟''
میرے استفسار کا انداز بڑا پراسرار اور رازدارانہ تھا۔ بشیرے اور منظورے نے بہ یک وقت چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان کے چہروں اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی سنسنی خیزی پائی جاتی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں بشیر لوہار نے بتایا۔
''جناب! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ شمشیر پور میں ''ہیر رانجھا'' کی یہ کہانی واقعی چل رہی تھی۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ریاض اور نازو دنیا والوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔''
''ہوں......!'' میں نے ایک گمبھیر سانس خارج کی اور کہا۔ ''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ نازو کا بھائی صفدر کوئی اچھا آدمی نہیں۔ اسے بدمعاشی اور غنڈا گردی کا بڑا شوق ہے...... بلکہ گاؤں سے باہر بھی ایسے ہی غنڈا عناصر سے اس کے بڑے گہرے اور دوستانہ تعلقات ہیں مثلاً لاکھو بدمعاش...... جو موضع چیاں والی میں رہتا ہے؟''
''جی ہاں، حقیقت تو یہی ہے۔'' انہوں نے بہ یک زبان ہو کر کہا۔
''ماشاء اللہ! آپ دونوں بڑے سمجھدار اور تجربہ کار انسان ہو۔'' میں نے باری باری بشیرے اور منظورے کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ لوگوں کی ساری زندگی شمشیر پور میں گزری ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور ایک ایک انسان کے مزاج سے گہری واقفیت ہے آپ کو۔ آپ کو کیا لگتا ہے......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔

''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ صفدر نے اپنی بہن نازو کا سارا غصہ ادھر ہی اتار دیا ہو۔'' میں نے انگلی سے باڑے کی سمت اشارہ کیا اور کہا۔ ''کچھ دن پہلے صفدر اور ان دونوں بھائیوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی اور ہاتھا پائی بھی ہو چکی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ صفدر نے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں...... اس دُہرے قتل کی واردات میں صفدر کا بھی تو ہاتھ ہوسکتا ہے؟''

''ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے مگر......!'' بشیر لوہار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''مگر کیا بشیرے؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میرے علم کے مطابق، صفدر تو کل صبح سے کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ گاؤں میں موجود نہیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ گاؤں میں ہے یا گاؤں سے باہر۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''وہ کہاں گیا ہوا ہے؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب!'' وہ بے بسی سے بولا۔

منظور موچی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''پتر تھانیدار! آپ ایسا کرو کہ صفدر کے گھر جا کر پتا کرو۔ اس کی بوڑھی والدہ اور بہن گھر پر ہی ہیں۔ صفدر کے بارے میں وہی کوئی صحیح بات بتا سکتی ہیں۔''

''ہاں جی......'' بشیر لوہار نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''منظورا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ صفدر کے گھر سے کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی ہے۔''

میں نے مزید دو چار سوالات کرکے انہیں فارغ کر دیا اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے، میں نے ان سے صفدر کے گھر کی لوکیشن بھی معلوم کرلی۔ جب میں جانے لگا تو بشیر لوہار نے مجھ سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! باڑے پر آپ نے جو تالا لگایا ہے اس کی چابی آپ کے پاس ہے اور آپ جانتے ہیں، وہاں نصف درجن سے زیادہ جانور بندھے ہوئے ہیں۔ اس واردات کے ہنگامے کی وجہ سے پتا نہیں، انہیں صبح بھی کچھ کھانے کو دیا گیا ہے یا نہیں اور آگے شام بھی آنے والی ہے......!''

اس نے ایک اہم نکتے کی طرف میری توجہ دلائی تھی۔ میں نے اس خیال سے باڑے کو لاک کیا تھا کہ اگر کسی کھوجی کی مدد سے قاتل کا سراغ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آسانی رہے لیکن زاہدہ کی زبانی صفدر اور نازو والا جو معاملہ مجھ تک پہنچا تھا اس کی روشنی میں کھوجی سے زیادہ صفدر اور لاکھو پر ''توجہ'' دینے کی ضرورت تھی۔ محض کھوجی کے کام کے لیے نصف درجن جانوروں کو بھوکا پیاسا نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا فیصلہ بدلنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

میں نے اپنی جیب میں سے، باڑے پر لگے ہوئے تالے کی چابی نکالی اور اسے بشیر لوہار کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ وہاں پر موجود جانوروں کو صبح شام چارا اور پانی دینا تمہاری ذمے داری ہے اور ہاں......'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا پھر تسلی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''چوری چکاری کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں رات کو باڑے کی نگرانی یا خفیہ حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس، سونے سے پہلے تالا وغیرہ چیک کرلیا کرنا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر زاہدہ نے اس بات پر کوئی اعتراض کیا تو میں کیا کہوں گا؟''

''تم کہہ دینا کہ یہ ڈیوٹی میں نے تمہارے سپرد کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے مجھے نہیں امید کہ زاہدہ کو تمہارے اس عمل پر کوئی اعتراض ہو۔ وہ اس وقت ایک مصیبت میں گھری ہوئی ہے۔ اسے آپ لوگوں کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔ اس کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار تو ہے نہیں۔ گاؤں کے لوگ ہی اس کے رشتے دار ہیں اور پھر تم تو اس کے پڑوسی بھی ہو۔ تمہارا سب سے زیادہ حق بنتا ہے۔ مجھے یقین ہے، تمہارے اس تعاون پر وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گی۔ اور بالفرض محال......'' میں نے بات نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اس نے تمہیں منع کیا یا تمہاری پرخلوص کوشش پر کوئی اعتراض کیا تو تم اس سے کوئی ضد بحث نہ کرنا، خاموشی کے ساتھ باڑے کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دینا۔''

''ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میرے ذہن سے ایک بوجھ اتار دیا ہے۔''

''بوجھ ذہن پر ہو یا دل پر، یہ بڑی خرابی پیدا کرتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہارا ذہن اس معاملے میں ہلکا پھلکا ہوگیا ہے تو میں چلتا ہوں۔''

منظور موچی نے پیشکش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تھانیدار جی! میں اسی طرف جارہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو صفدر کے گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔''

میں خاموشی سے منظورے کے ساتھ ہولیا۔

☆☆☆

شام کے سائے پھیلنا شروع ہوگئے تھے۔ میں اس وقت کانسٹیبل ارشد کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھ کر موضع چُیاں والی جارہا تھا۔ ہم چند منٹ بعد اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے۔ میرے تھانے سے چیاں والی اور شمشیر پور کا فاصلہ لگ بھگ ایک جیسا تھا، بس سمت کا فرق تھا۔ شمشیر پور تھانے سے جنوب میں اور چیاں والی جنوب مغرب میں واقع تھا۔ جبکہ یہ دونوں گاؤں آپس میں صرف دو میل کی دوری پر تھے۔ چیاں والی جانے کا مقصد تھا، صفدر اور لاکھو سے ملاقات کرنا!

دوپہر کے وقت میں صفدر کے گھر گیا تھا اور اس کی ماں سے ملاقات ہوگئی تھی۔ بوڑھی کریماں بی بی ہی نے مجھے بتایا کہ صفدر اپنے دوست سے ملنے چیاں والی گیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا، کیا اس کے دوست کا نام لاکھو ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ وہ نازو اور ریاض والے ''معاملے'' کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ دُہرے قتل والی واردات کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی اور اسے اس واقعے کا بڑا دکھ تھا۔

میں نے نازو سے بھی علیحدگی میں بات کی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے اور ریاض کے تعلق سے انکار کرتی رہی۔ جب میں نے سخت رویہ اختیار کیا اور کہا کہ میرے پاس اس معاملے کے عینی شاہد بھی ہیں۔ اگر اس نے غلط بیانی کی تو میں تفتیش کے لیے اسے تھانے بھی بلا سکتا ہوں' پھر گواہوں کے ساتھ اسے عدالت کے حوالے کردوں گا۔ اس طرح اس کی جو رسوائی ہوگی اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ لے!

وہ میری اس دھمکی سے خوفزدہ ہوگئی اور بڑی شرافت سے اس نے اقرار کرلیا کہ وہ ریاض کو پسند کرتی تھی اور یہ کہ وہ چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ میں نے جب اس امکان کی جانب اس کی توجہ دلائی کہ ان دونوں بھائیوں کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے میں صفدر کا ہاتھ ہوسکتا ہے تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا۔

''نہیں تھانیدار جی! میرا بھائی چھوٹی موٹی غنڈا گردی تو کرتا ہے لیکن وہ کسی کے خون میں ہاتھ نہیں رنگ سکتا...... صفدر قاتل نہیں ہے جی۔''

''پچھلے دنوں اس کا دونوں بھائیوں سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔'' میں نے اس کی افسردہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور صفدر نے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔ اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''مجھے اس کے بارے میں ریاض نے بتایا تھا جی۔''

وہ غمزدہ انداز میں بولی۔ ''اور میں نے اس سے کہا تھا، وہ زیادہ پریشان نہ ہو...... وہ جی، دراصل صفدر غصے کا بڑا تیز ہے۔ بہت جلدی جوش میں آجاتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہم نے یہی طے کیا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے ملنا چھوڑ دیں۔ آٹھ دس دن سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور آج صبح سنا کہ......'' بولتے بولتے نازو کی آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہوگئی۔

اس کے انداز اور تاثرات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ واقعی مقتول ریاض کو چاہتی تھی کیونکہ جذبات اور احساسات کبھی ''غلط بیانی'' سے کام نہیں لیتے۔ میں چند لمحات تک اس مغموم حسینہ کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جو لوگ بڑے جوشیلے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے غصے پر قابو نہیں ہوتا، ان سے کسی بات کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے صفدر کی ذات شک سے بالاتر نہیں ہوسکتی۔''

''آپ چاہے کچھ بھی کہیں جی پر میرا دل نہیں مانتا کہ صفدر نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا ہوگا۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ''وہ غنڈا بدمعاش تو ہوسکتا ہے مگر قاتل نہیں۔ وہ ساری غصے والی باتیں اس نے ریاض کو ڈرانے کے لیے کی تھیں تاکہ وہ مجھ سے ملنا چھوڑ دے...... وہ تو دنیا ہی چھوڑ کر چلا گیا......!'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔

نازو کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ زاہدہ نے اس کے حسن کی بے جا تعریف کی تھی اور نہ ہی ریاض عقل کا اندھا تھا۔ نازو بنی بنائی موم کی گڑیا تھی۔ ہر دیکھنے والا اسے پانے کی تمنا کرسکتا تھا۔ وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی۔

اس کی کیفیت قدرے بحال ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''تمہاری ماں نے بتایا ہے کہ صفدر کل سے چیاں والی گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی کے بارے میں کچھ بتاسکتی ہو؟''

''وہ اپنی مرضی کا مالک ہے جی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہ تو کہیں جاتے ہوئے کسی سے پوچھتا ہے اور نہ ہی واپسی کے بارے میں کچھ بتا کر جاتا ہے۔''

''وہ اس سے پہلے بھی تو چیاں والی جاتا رہتا ہے نا؟''
''جی، وہ اکثر وہاں جاتا رہتا ہے۔'' نازو نے جواب دیا۔
''عموماً اس کی واپسی کتنے دن کے بعد ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''کبھی ایک دن، کبھی دو دن اور کبھی تین چار دن...''
اس کا جواب ایسا ہی تھا جیسے بغیر سر پیر کے کوئی کہانی۔ میں نے پھر اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے گھر سے نکل آیا تھا۔
''اگر وہ آج کسی وقت واپس لوٹ آئے تو اس سے کہنا، فوراً تھانے آکر مجھ سے ملاقات کرے۔ ٹھیک ہے؟''
اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔
میں شمشیر پور سے تھانے آیا۔ حوالدار حنیف باجوہ کو سختی سے ہدایت کی کہ اگر میری غیر موجودگی میں صفدر تھانے آئے تو وہ اسے ''بٹھا'' لے۔ میں رات کو کسی بھی وقت چیاں والی سے لوٹ آؤں گا۔
حنیف باجوہ نے کہا تھا۔ ''ملک صاحب! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں صفدر کو تھانے میں ایسا ''بٹھاؤں'' گا کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔''
اور...... میں واقعی بے فکر ہو کر کانسٹیبل ارشد علی کے ہمراہ چیاں والی کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔
ہم مغرب کی اذان سے چند منٹ پہلے چیاں والی پہنچ گئے۔ چیاں والی، شمشیر پور کی بہ نسبت ایک چھوٹا گاؤں تھا حالانکہ شمشیر پور کا شمار بھی بڑے گاؤں میں نہیں ہوتا تھا۔ اس گاؤں میں اسی نوے گھر آباد تھے جب کہ چیاں والی کا حال یہ تھا کہ وہاں بہ مشکل پچاس مکان ہوں گے۔
یہ چیاں والی آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا لہٰذا پوچھتے پاچھتے ہم لاکھو کے گھر تک پہنچ ہی گئے۔ وہ اپنے گھر پر اکیلا ہی رہتا تھا اور اس کا یہ گھر ڈیرا کہلاتا تھا۔ لاکھو کا مذکورہ ڈیرا گاؤں کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اس سے آگے سرسبز کھیتوں کا وسیع و عریض سلسلہ تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔
ہمارا تانگا لاکھو کے ڈیرے کے سامنے جا رکا۔ میں اور ارشد علی تانگے سے اترے اور ڈیرے کے گیٹ پر پہنچ گئے۔
اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی گیٹ پر دستک دیتا، گیٹ کھلا اور وہاں ایک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ کوئی ملازم صورت شخص تھا۔ ہم پر نظر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی اتنی تاریکی بھی نہیں چھائی تھی کہ وہ ہمیں پولیس یونیفارم میں نہ دیکھ سکتا۔
پولیس کی وردی کا ایک اپنا رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ انہیں دروازے کے سامنے پایا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''اوئے پولیس، اتنی جلدی... ایک دن پہلے ہی....''
اتنا کہتے ہی اس نے جلدی سے گیٹ بند کرنا چاہا لیکن اس وقت تک میں اپوزیشن میں آچکا تھا۔ میں نے ایک عقابی جھپٹا مارا اور اس [illegible] جا لیا۔ وہ شاید مجھ سے ایسی تیزی اور مستعدی کی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے بوکھلا کر گیٹ بند کرنا بھول گیا اور اندر کی جانب دوڑ لگانے کی کوشش کی۔
میں بھلا اس کی کوشش کو کیسے کامیاب ہونے دیتا۔ میں نے اسے من مانی کرنے کے لیے تو جھپٹا نہیں مارا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ڈیرے کے اندرونی حصے میں آگئے۔ اس دوران میں کانسٹیبل ارشد علی نے موقع محل کی مناسبت سے پھرتی دکھائی اور ڈیرے کے گیٹ کو اندر سے بند کر دیا۔
وہ ڈیرا دو کمروں اور ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ ہم اس وقت صحن کے ابتدائی حصے میں تھے جو نسبتاً گیٹ سے زیادہ قریب تھا۔ میری اور اس شخص کی نبرد آزمائی سے کچھ ایسی آوازیں پیدا ہوئی تھیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ آوازیں ڈیرے کے اندرونی کمروں تک بھی پہنچی تھیں، جبھی ادھر سے ایک بھاری بھرکم سی استفساریہ آواز ابھری۔ ''بخشو! کون ہے باہر؟''
''بخشو'' یقیناً اسی شخص کا نام تھا جسے میں نے اپنی بغل میں دبوچ رکھا تھا۔ اس کے لیے تو آسانی سے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا، وہ کسی کے سوال کا کیا جواب دیتا۔ میں نے بڑی سرعت سے بخشو کو ارشد کے حوالے کیا اور کمروں کی سمت بڑھ گیا۔ میری تمام تر توجہ اس کمرے کی جانب تھی جدھر سے بھاری بھرکم آواز میں بخشو کو پکارا گیا تھا۔ مجھے ارشد کے مضبوط و توانا بازوؤں سے قطعی امید تھی کہ وہ بخشو کی قوت گویائی کو مسلسل بریک لگائے رہیں گے۔
میں نے اندرونی کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اپنا سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں کر لیا تھا۔ جب باہر سے بخشو نے کوئی جواب نہیں دیا تو پکارنے والا صورتِ حال جاننے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ میں اس وقت کمرے کے دروازے کے قریب ہی ایک دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ وہ شخص مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا جب کہ میری نگاہ اسی پر لگی ہوئی تھی۔
وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک، حد سے زیادہ صحت مند شخص تھا۔ دراز قامتی نے اس کے ڈیل ڈول کی ہیبت ناکی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق، اس ڈیرے پر دو افراد کو ہونا

چاہیے تھا۔ نمبر ایک لاکھو، نمبر دو صفدر...... میں نے ان دونوں میں سے کبھی کسی کو دیکھا نہیں تھا۔ ڈیرے کے گیٹ پر جس بندے سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی وہ یقینی طور پر بخشو تھا کیونکہ اسے اسی نام سے پکارا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ گینڈا یا تو صفدر تھا اور یا پھر وہ لاکھو تھا!

مذکورہ جناتی شخص نے کمرے سے باہر آکر گیٹ کی سمت نگاہ دوڑائی جہاں ارشد نے بخشو کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ شخص دو قدم مزید آگے بڑھا اور الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''بخشو! تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔ گیٹ کے پاس کیا معاملہ ہو گیا ہے...... تم تو تانگے کا انتظام کرنے گئے تھے اور......''

اسی لمحے کمرے کے اندر سے ایک اور مردانہ سوالیہ آواز ابھری۔ ''لاکھو! کیا مسئلہ ہے یار۔ تم بار بار بخشو کو کیوں آواز دے رہے ہو۔ کیا کوئی پھڈا ہو گیا ہے؟''

اس استفسار نے میرے ذہن کی الجھن کو سلجھن میں بدل دیا۔ اگر وہ گینڈا لاکھو تھا تو کمرے کے اندر موجود شخص یقیناً صفدر رہا ہو گا یعنی میرے دونوں مطلوبہ شخص میرے آس پاس ہی تھے۔ اس احساس نے میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑا دی۔

اس سے پہلے کہ گینڈا بدن لاکھو، صفدر کے سوال کے جواب میں کچھ کہتا، میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اندھیرے میں سے نکل کر اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا پھر غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لاکھو! کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔''

''تت...... تم کون ہو؟'' وہ ہکلایا۔

میں چونکہ اس کی پشت پر موجود تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ نہیں پا رہا تھا اور اس نادیدگی کو تاریکی کا تعاون بھی حاصل تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لاکھو! میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ اتنا تعارف کافی ہے یا......؟''

میں نے دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''اوہ...... تھانیدار صاحب......!'' اتنا کہتے ہی وہ بڑے رضاکارانہ اور پرسکون انداز میں ''ہینڈز اپ'' ہو گیا۔

لاکھو کی جانب سے شرافت کے اس مظاہرے نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ دراصل، ان لمحات میں، میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ جب گیٹ پر مجھے بخشو کی صورت دکھائی دی تھی تو اسے میں نے یہ کہتے ہوئے سنا تھا...... ''اوئے، پولیس۔ اتنی جلدی...... ایک دن پہلے ہی!'' اس کے بعد جب لاکھو کمرے میں سے باہر نکل کر بخشو کو پکار رہا تھا تو اس کے منہ سے یہ نکلا تھا۔ ''بخشو! تم تو تانگے کا انتظام کرنے گئے تھے اور......!''

ان دو افراد کے دو جملوں کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ اس ڈیرے پر بیٹھ کر کسی واردات کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور یہ واردات آج رات کسی وقت وہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس صورت میں ضروری تھا کہ پولیس کا پتا چلتے ہی لاکھو وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا جبکہ اس کے برعکس وہ بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کر رہا تھا...... اور یہی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی!

میں نے تحکمانہ انداز میں لاکھو سے پوچھا۔ ''کیا صفدر کمرے کے اندر موجود ہے؟''

''جی ہاں، وہ اندر ہی ہے۔'' اس نے بڑی فرماں برداری سے جواب دیا۔

''اور کون کون ہے اندر؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''کوئی نہیں جناب...... ہم تینوں کے سوا اس ڈیرے پر کوئی چوتھا شخص موجود نہیں۔''

میں نے اس کی تسلی اور اپنی آسانی کے لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لاکھو! اگر اس وقت تم کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہو تو تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں ایک خاص حوالے سے معمول کی پوچھ گچھ کرنے آیا ہوں۔ تم کمرے کے اندر چلو۔''

پھر میں نے صحن کی طرف منہ اٹھا کر ارشد علی کو مخاطب کیا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''ارشد! حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ تم بخشو کو گرفت میں لے لو۔ اس کا انٹرویو ہم بعد میں کریں گے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے لاکھو کو ٹہوکا دیا جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اب اسے میرے حکم کے مطابق صفدر کے پاس کمرے کے اندر چلنا چاہیے۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں اس کے عقب میں رہتے ہوئے کمرے کے اندر آ گیا۔ اندر لالٹین روشن تھی اور اس کی روشنی میں مجھے صفدر بھی نظر آ گیا۔ صفدر، لاکھو کی بہ نسبت خاصا ''اسمارٹ'' تھا۔ اس نے اپنے ساتھی لاکھو کو گن پوائنٹ پر دیکھا تو گھبرا گیا۔ ایک

لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن دروازے میں موجود ہونے کی وجہ سے میں نے چونکہ فرار کی راہ مسدود کر رکھی تھی لہٰذا اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے لاکھو کو ایک ''مناسب'' سا دھکا دیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم ادھر جا کر صفدر کے ساتھ بیٹھو!''

اس کے لیے میرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

مذکورہ کمرے میں پہلو بہ پہلو دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک آہنی کرسی بھی رکھی نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں ایک چارپائی پر جڑ کر بیٹھ گئے اور میں نے آہنی کرسی سنبھال لی پھر اس سے پہلے کہ میں پوچھ گچھ کا آغاز کرتا، لاکھو نے متذبذب لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

''ملک صاحب! آپ یہاں...... اور اچانک! خیریت تو ہے نا؟''

''پولیس اور خیریت کی آپس میں بڑی پرانی دشمنی ہے لاکھو!'' میں نے اس کی آنکھوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''جہاں خیریت ہوتی ہے، وہاں پولیس دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔''

''تو...... کیا چیاں والی میں کوئی سنگین واردات ہوگئی ہے؟'' اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہاں...... واردات تو ہوئی ہے لیکن چیاں والی میں نہیں بلکہ اُدھر شمشیر پور میں۔'' میں نے صفدر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا...... کیا ہوگیا ہے وہاں......؟'' صفدر اضطراری انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''یہ بھی تم مجھی سے پوچھو گے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تو اس بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے!''

اس دوران میں، میں صفدر اور لاکھو، خصوصاً صفدر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کررہا تھا۔ لالٹین کی روشنی اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھی مگر میرے مقصد میں کسی قسم کی کوئی دشواری محسوس نہیں ہورہی تھی۔ ان دونوں کے چہروں کی کیفیت مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔

میرے کٹیلے استفسار پر صفدر نے متذبذب انداز میں لاکھو کی جانب دیکھا۔ تاثر ایسا ہی تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جواباً لاکھو نے چہرے کے تاثرات سے اپنی بے خبری اور لاعلمی کا اظہار کردیا۔ صفدر دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب!'' اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج بھی شامل تھا۔ ''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کس واقعے کی بات کررہے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا، وہاں شمشیر پور میں کیا ہوگیا ہے۔ میں تو کل صبح سے یہاں لاکھو کے پاس آیا ہوا ہوں۔ میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ لاکھو سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''ملک صاحب!'' میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی لاکھو نے کہا۔ ''صفدر غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ یہ واقعی کل میرے پاس آیا تھا۔''

''نہ تو صفدر غلط بیانی کررہا ہے اور نہ ہی کریماں بی بی اور نازو نے مجھ سے کوئی جھوٹ بولا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''صفدر واقعی کل صبح شمشیر پور سے چیاں والی آیا تھا اور اس وقت بھی یہاں موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ......'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''...... وہ پچھلی رات کو تھوڑی دیر کے لیے شمشیر پور نہ گیا ہو...... اکیلا یا تمہارے ساتھ لاکھو۔ آخر شمشیر پور یہاں سے دور ہی کتنا ہے؟''

''یہ آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں ملک صاحب!'' لاکھو نے قدرے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ پچھلی پوری رات یہ میرے ساتھ اسی ڈیرے پر تھا۔ اگر کسی نے اس کے نام پر ادھر شمشیر پور میں کوئی واردات کردی ہے تو اس میں صفدر بے چارے کا کیا قصور ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ شمشیر پور میں ہوا کیا ہے؟''

''وہاں پچھلی رات دہرے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات ہوئی ہے!'' میں نے دھماکا کرنے والے انداز میں کہا۔ ''دو گبرو بھائیوں کا بہیمانہ قتل!''

''قتل کی واردات......؟'' انہوں نے بہ یک وقت بہ یک زبان ہوکر کہا۔

میں نے انہیں گھورتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

صفدر نے ہیجانی انداز میں دریافت کیا۔ ''آپ قتل ہونے والے کن دو بھائیوں کا ذکر کررہے ہیں تھانیدار صاحب؟''

''ریاض اور فیاض کی بات کررہا ہوں!'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''اوہ......!'' اس کے ہونٹوں سے ایک مایوس اور متاسفانہ آواز نکلی۔ ''انہیں کس نے قتل کردیا؟''

''ان کے قاتل کی تلاش ہی میں تو میں شمشیر پور سے چیاں والی پہنچا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو..... آپ کا مطلب ہے، ان دونوں بھائیوں کا قاتل یہاں پنیاں والی میں چھپا ہوا ہے؟'' لاکھو نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آثار اور اشارے تو ایسے ہی ملے ہیں.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''اسی لیے میں قاتل کے تعاقب میں یہاں پہنچا ہوں۔''

''لیکن قاتل ہے کون؟'' لاکھو کے استفسار میں احتجاج شامل تھا۔

میں نے بدستور مضبوط لہجے میں کہا۔''یہ تو تم دونوں ہی بتاؤ گے!''

''ہم دونوں کیوں؟'' لاکھو کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔

میں نے کہا۔''اس لیے کہ ریاض اور فیاض کا قاتل تم دونوں کے اندر چھپا ہوا ہے۔ یا تو تم قاتل ہو!'' میں نے انگلی سے صفدر کی جانب اشارہ کیا پھر لاکھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''یا تم نے ان دونوں بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔'' میں نے سنسنی خیز انداز میں توقف کیا پھر کہا۔

''یا پھر تم دونوں نے مل کر یہ کارنامہ انجام دیا ہے!''

''آپ.....آپ کس بنا پر یہ بات کر رہے ہیں.....؟''

''میرے پاس اس بات کو کہنے کے لیے بڑی مضبوط بنیاد ہے!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا پھر بڑے واشگاف الفاظ میں اپنے دعوے کی وضاحت کر دی۔

وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری بات سن رہے تھے۔ میں انہیں ریاض اور صفدر کی بہن نازو والے معاملے سے آگاہ کر رہا تھا پھر اس جھگڑے کا ذکر بھی آیا جو صفدر نے دونوں مقتولین سے، ان کی موت سے چند روز قبل کیا تھا۔ میں نے اس ذیل میں صفدر کی خطرناک دھمکیوں کا بھی ذکر کیا اور آخر میں کہا۔

''آپ لوگوں کو اس 'بنیاد' میں کوئی کمی یا کمزوری نظر آرہی ہے؟''

وہ دونوں الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔''صفدر! تمہاری دھمکی کے چند روز بعد وہ دونوں بھائی بڑے وحشیانہ انداز میں قتل کر دیے گئے۔ اب اگر میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا تمہارے دوست لاکھو کے ڈیرے پر آگیا ہوں تو اس میں، میں کہاں غلطی پر ہوں؟''

وہ اچانک ہی پھٹ پڑا۔''تھانیدار صاحب! آپ صفدر حیات ہیں اور میں صفدر حسین..... ہم دونوں کے نام میں ایک ہی ترتیب سے ص اور ح آتا ہے۔ آپ اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر ایک بات بتائیں.....؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیا پوچھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں پوچھو.....!''

اس نے پوچھا۔''اگر کوئی لفنگا آپ کی بہن کو ورغلا رہا ہو، اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہا ہو تو آپ کیا کریں گے؟''

''ورغلا رہا ہو یا اس سے محبت کر رہا ہو؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔''کچھ بھی سمجھ لیں.....!''

''کچھ بھی سمجھنے سے بات نہیں بنتی صفدر حسین۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس شخص کا میری بہن کے ساتھ کس نوعیت کا تعلق ہے۔ کسی سے محبت کرنے یا اس کو ورغلانے میں بڑا فرق ہوتا ہے اور.....'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے کسی شخص کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''لفنگا'' کہا ہے۔ میں یہ دیکھنا بھی ضروری سمجھوں گا کہ وہ لفنگا ہے یا کوئی شریف النفس اور معقول انسان ہے میرے خیال میں ریاض کو لفنگا کہنا درست بات نہیں ہوگی!''

اس نے نگاہ چرانے والے انداز میں کہا۔''چلیں، آپ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے بتائیں کہ آپ اس صورت میں کیا کریں گے؟''

''دیکھو صفدر حسین!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔''اگر کوئی معقول شخص میری بہن سے محبت کر رہا ہو اور میں یہ بھی دیکھوں کہ میری بہن بھی اس سے محبت کرتی ہے تو میں ان کی مدد کروں گا۔ ان سے کہوں گا کہ وہ چھپ چھپ کر کھیتوں میں نہ ملا کریں۔ میں ان کے مستقل ملاپ کی کوئی سبیل نکالوں گا مگر تمہاری طرح.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سلگتے ہوئے انداز میں کہا۔

''تمہاری طرح میں اس لڑکے کو بیچ راہ روک کر اس کی پٹائی کروں گا، نہ ہی اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دوں گا اور نہ ہی.....''

میں نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا پھر کہا۔''اور نہ

ہی اسے اس کے بھائی سمیت، رات کو سوتے میں کلہاڑی کے وار کر کے......!''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا......'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا کر بولا۔ ''بلکہ ہم نے تو اس کے لیے کچھ اور ہی......!''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا، انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو یا پھر یہ کہ اسے احساس ہو گیا ہو کہ اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے، کوئی ایسی بات جو اسے کسی بڑی مصیبت میں پھنسا سکتی ہو!

اس موقع پر صفدر کے یارِ غار لاکھو نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس نے بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''صفدر! کیا خیال ہے...... تھانیدار صاحب کو حقیقت بتا دیں؟''

صفدر نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر لاکھو سے کہا۔ ''ہاں، تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ اگر اب بھی ہم نے اپنی زبانیں بند رکھیں تو یہ مجھے ان دونوں بھائیوں کا قاتل سمجھتے رہیں گے۔''

''تو بتاؤ...... تم شروع کر رہے ہو یا میں سناؤں انہیں تمہاری کہانی؟'' لاکھو نے صفدر حسین سے پوچھا۔

''یار! تم ہی بتا دو۔'' وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا۔ ہم یہاں کچھ اور ہی منصوبہ بنا رہے تھے اور انہوں نے آ کر سارا کام خراب کر دیا ہے۔''

میں نے لاکھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لاکھو! تم لوگوں کو جو کچھ بھی کہنا ہے، سادہ اور آسان الفاظ میں کہہ ڈالو۔ میں یہاں تمہارے قصے اور کہانیاں نہیں سننے آیا ہوں۔ ادھر تھانے میں مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔''

''جی......!'' لاکھو نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی پھر اس سے پہلے کہ وہ بیان شروع کرتا، باہر ارشد علی کی آواز بلند ہوئی۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ''ملک صاحب! یہ بندہ تو پوری طرح میرے قابو میں ہے لیکن کبھی کبھی تنگ کرنے لگتا ہے۔ یہاں اچھا خاصا اندھیرا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے کمرے کے اندر لے آتا ہوں ورنہ اس کی کسی چالاکی کے جواب میں اگر میں نے اپنے ہاتھوں کو بے سمت حرکت دے دی تو اس کی گردن کا کڑاکا نکل جائے گا۔''

''ارشد! بخشو کا منکا نہیں توڑنا۔ ابھی اس کا بیان بھی لینا ہے۔'' میں نے جواباً بہ آواز بلند کہا۔ ''اندر سب خیریت ہے لے آؤ اسے بھی۔''

پھر میں دوبارہ لاکھو گینڈے کی طرف متوجہ ہو گیا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہاں بھئی! تم کیا بتانے والے تھے...... شروع ہو جاؤ۔ شاباش!''

اور وہ شروع ہو گیا۔ ''میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا، تھانیدار صاحب...... کہ صفدر نے مجھے اپنی بہن اور ریاض کے چکر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے سمجھانے بجھانے کا جب کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے مجھ سے کہا کہ اس گدھے کے بچے کو تھوڑا سبق سکھانا چاہیے۔ اسی سلسلے میں یہ کل میرے پاس آیا تھا۔ ہم دونوں مل کر ریاض کا دماغ درست کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ایک دن کی سوچ بچار کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ریاض کو مستقل طور پر لنگڑا بنا دیں۔ وہ ایک ٹانگ پر دباؤ ڈال کر جب اوپر نیچے جھٹکے کھاتے ہوئے چلتا دکھائی دے گا تو بڑا مزہ آئے گا۔ پھر بھی اسے اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ نازو سے ملے یا اس کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہم یہاں ڈیرے پر بیٹھے یہی منصوبہ بنا رہے تھے اور جب ایک فیصلے پر پہنچ گئے تو ہم نے بخشو کو تانگے وغیرہ کا بندوبست کرنے بھیج دیا تبھی...... میں نے کمرے سے باہر نکل کر بخشو سے یہ پوچھا تھا...... تم تانگے کا انتظار کرنے گئے تھے......!''

''اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔'' میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ''جب ڈیرے کے گیٹ پر بخشو نے ہمیں دیکھا تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ کیوں نکلا تھا...... اوئے پولیس، اتنی جلدی...... ایک دن پہلے ہی......''

میں نے لمحاتی توقف...... کے بعد صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں صفدر حسین! اب مجھے بتاؤ کہ تم کس فیصلے پر پہنچے تھے۔ آج رات تم لوگ کس طرح ریاض کو لنگڑا بنانے والے تھے؟ اور تمہارے جواب دینے سے پہلے میں تمہیں یہ بتاتا چلوں کہ ریاض زور زبردستی سے، نازو سے ملاقات نہیں کرتا تھا لہٰذا آنکھ اٹھا کر دیکھنے یا نہ دیکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دونوں اپنی مرضی اور پسند سے ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ بہرحال، تم بتاؤ کہ اس ڈیرے پر پکنے والی کھچڑی کا ذائقہ کیسا ہے؟''

''کھچڑی'' اور ''ذائقہ'' کے الفاظ پر اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کی آسانی کے لیے جلدی سے وضاحت

کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم لوگ جس مشن پر جانے والے تھے اس کی تفصیل کیا ہے۔ ریاض کے ساتھ، تمہارا کیا کرنے کا ارادہ تھا۔ تم کس طریقے سے اسے لنگڑا بناتے؟''

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بتانے لگا۔ ''جناب! جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے کہ ہم نے ریاض کی ایک ٹانگ توڑنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ ریاض اور فیاض آج کل رات کو باڑے میں سو رہے ہیں...''

''سو رہے ہیں نہیں...... بلکہ سویا کرتے تھے۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''پچھلی رات وہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔ اب انہیں بار بار سونے جاگنے کی حاجت نہیں رہے گی۔''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''منصوبے کے مطابق، ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر آدھی رات کو شمشیر پور پہنچتے اور بڑی خاموشی سے دیوار پھلانگ کر ڈیرے کے اندر داخل ہوجاتے۔ اس کے بعد ہم ان سوتے ہوئے بھائیوں میں سے ایک ایک کو سنبھال لیتے۔ ہمیں صرف ریاض کو ایک ٹانگ کے استعمال سے محروم کرنا تھا۔ ٹخنے کے مقام پر ایسی ضرب لگائی جاتی کہ ہڈی چکنا چور ہوکر رہ جاتی پھر ہم وہاں سے واپس آجاتے۔ اللہ اللہ...... خیر سلا!''

''اللہ اللہ، خیر سلا...... اتنا بھی سہل نہیں ہوتا صفدر حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کارروائی کے دوران میں اس بات کے بڑے قوی امکانات موجود تھے کہ وہ دونوں بھائی یا ان میں سے کوئی ایک تم لوگوں کو پہچان لیتا۔ تم پہچان لیے جانے کا خطرہ مول لینے کے لیے کیسے تیار ہوگئے؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب......'' لاکھو نے میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو چہروں پر ڈھاٹے لگا کر وہاں جانا تھا۔ ان میں سے کوئی ہمیں شناخت نہیں کرسکتا تھا، پھر یہ کہ ہم انہیں جان پہچان اور شناخت کی مہلت ہی نہ دیتے۔ یہ تو بہ مشکل تین چار منٹ کی کارروائی تھی جیسے ہی ہم ریاض کے گٹے (ٹخنے) کا جنازہ نکالتے، فیاض ہمیں بھول کر اس کی فکر میں لگ جاتا اور ہم اس موقع کا فائدہ اٹھا کر جائے واردات سے غائب ہوجاتے......'' وہ اتنا بتا کر تھما پھر عام سے لہجے میں بولا۔

''میں نے ساری حقیقت آپ کو بتادی ہے۔ یقین کریں یا نہ کریں یہ آپ کی مرضی ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم دونوں کی کہانی سن لی لیکن تم لوگ یہ مت سمجھنا کہ میں اس اسٹوری پر آنکھیں بند کر کے یقین کرلوں گا۔ تمہارے بیان کو چیک کرنا بہت ضروری ہے اور جب تک یہ چیک نہیں ہو جاتا، تم میرے مہمان رہو گے!''

''مہمان...... کیا مطلب جناب؟'' صفدر نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں۔ جب تک ان دونوں بھائیوں کا قاتل میری گرفت میں نہیں آجاتا، تم تینوں تھانے کی حوالات میں رہو گے۔''

''یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہوگی تھانیدار صاحب......!'' لاکھو نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔

میں نے آئندہ چند منٹ میں انہیں ''زیادتی'' اور ''قانونی کارروائی'' کے فرق سے آگاہ کیا پھر اپنے ساتھ تانگے میں بٹھا کر تھانے لے آیا۔ یہ وہ تانگا نہیں تھا جس میں بیٹھ کر ان دونوں دوستوں نے مقتول ریاض کا گٹا توڑنے جانا تھا۔ مذکورہ تانگے کو لانے کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ بخشو، ڈیرے کے گیٹ سے نکلتے ہی ہمارے ہتھے چڑھ گیا تھا گویا، سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی صورتِ حال ہوگئی تھی۔

ان تینوں نے راستے میں بڑی شرافت کا ثبوت دیا اور ہم بخیر وعافیت موضع چیاں والی سے واپس تھانے آگئے۔

☆☆☆

اگلی صبح میں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ بشیر لوہار کافی دیر سے میرے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلالیا۔

بشیر لوہار وہ شخص تھا جس نے گزشتہ روز اس دُہرے قتل کی واردات کی اطلاع مجھے دی تھی۔ وہ مقتولین کا پڑوسی تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک معقول اور بھلے مانس انسان تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے حاضر ہوگیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''بشیرے! خیریت تو ہے...... یہ صبح ہی صبح تم مجھ سے ملنے آگئے؟''

''میں تو رات ہی کو آنے والا تھا جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''
''جی......!'' اس نے مختصر سا جواب دینے کے بعد گردن جھکا لی۔
''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔
وہ ندامت آمیز آواز میں بولا۔ ''جناب! میں اپنی ذمے داری پوری نہیں کر سکا۔''
''کون سی ذمے داری؟'' میرے لہجے میں الجھن شامل ہوگئی۔
''وہ...... آپ نے میری ڈیوٹی لگائی تھی نا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر ڈیرے پر بندھے ہوئے مال مویشیوں کی دیکھ بھال مجھے کرنا تھی۔ میں اسی ذمے داری کی بات کر رہا ہوں......''
''کیا مویشی چوری ہونے کا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہے؟'' میں نے حالیہ صورت حال کی روشنی میں ممکنہ خدشے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔
''نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے جو ذمے داری سونپی تھی، زاہدہ نے وہ پوری نہیں کرنے دی۔ اس نے رات ہی کو مجھ سے باڑے کی چابی لے لی تھی...... بلکہ میرا تالا اتار کر وہاں اپنا تالا لگا دیا ہے۔ میں رات ہی کو آپ کے پاس آنے والا تھا پھر سوچا کہ صبح جاؤں گا اور اب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں......''
''اوہ...... بس اتنی سی بات کے لیے تم پریشان ہو۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ نے اگر باڑے کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ تم کیوں فکرمند ہو رہے ہو؟'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''کل میں نے تم پر واضح کر دیا تھا کہ اگر زاہدہ کو تمہارے اس پرخلوص عمل پر کوئی اعتراض ہو تو تم کسی بحث مباحثے میں نہ پڑنا بلکہ باڑے کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دینا......''
وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! اگر زاہدہ نے باڑے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا ہوتا تو شاید میں پریشان نہ ہوتا......!''
''تم کہنا کیا چاہتے ہو بشیرے!'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''زاہدہ نے باڑے کا نظام کس کو سونپا ہے؟''
''اس بندے کا نام سلطان ہے جناب!'' بشیر لوہار نے جواب دیا۔ ''پتا چلا ہے، وہ زاہدہ کا کوئی دور پار کا رشتے دار ہے۔ میں نے شمشیر پور میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا، وہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑا ہے!''
سلطان کا نام سنتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ زاہدہ نے اپنے کسی تایا زاد کا ذکر کیا تھا۔ اس کے مطابق، سلطان نامی وہ شخص اس کا واحد رشتے دار تھا جو شمشیر پور سے پانچ میل مشرق میں واقع موضع جالال نگر میں رہتا تھا۔ زاہدہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے اپنے اس اکلوتے رشتے دار کو بلانے کے لیے ایک بندہ ادھر جالال نگر روانہ کر دیا ہے۔ مجھے صد فی صد یقین تھا کہ سلطان گزشتہ رات شمشیر پور پہنچ گیا تھا اور بشیر لوہار اسی بندے کا ذکر کر رہا تھا۔
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بشیرے! یہ سلطان جو ہے نا، یہ زاہدہ کے تایا کا بیٹا ہے جو موضع جالال نگر کا رہنے والا ہے۔ وہ ریاض اور فیاض کے قتل کا سن کر ادھر آیا ہے۔ زاہدہ نے کل مجھے سلطان کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ تم سلطان کی وجہ سے خود کو پریشان نہ کرو......!''
''جناب......!'' وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔
میں نے استفساری لہجے میں پوچھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو بشیرے؟''
''تھانیدار جی!'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''یہ بندہ سلطان مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔ اس کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہے۔''
''وہ کیا اچھا نہیں ہے؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں دریافت کیا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہیں سلطان میں کون سی برائی نظر آئی ہے؟''
''بس جی...... میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا......'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''عجیب سا بندہ ہے جی۔ کھا کھا کر سانڈ کی طرح پلا ہوا ہے، رنگ توے کی طرح سیاہ، آنکھیں سرخ اور انداز و اطوار سے مکاری جھلکتی ہے...... آپ ادھر آ کر خود دیکھ لیں جی۔ وہ آپ کو بھی پسند نہیں آئے گا۔''
''ٹھیک ہے......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں بہت جلد شمشیر پور آؤں گا اور دیکھوں گا، وہ سلطان کس قماش کا آدمی ہے!''
''میں جاؤں جی......!'' اس نے اجازت طلب کرنے والے انداز میں پوچھا۔
''اگر تمہیں اور کچھ نہیں کہنا تو مطمئن ہو کر جاؤ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے، میں دوپہر کے بعد ادھر چکر لگاؤں۔''
وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو دروازے کے

قریب سے پلٹ آیا اور پوچھنے لگا۔ ”میں نے سنا ہے جی! آپ نے دو بندوں کو کل رات پکڑا ہے۔ ان میں ایک ہمارے گاؤں کا صفدر اور دوسرا اس کا یار لاکھو ہے۔ کیا انہوں نے ریاض اور فیاض کے قتل کا اقرار کرلیا ہے؟“

بشیرا ہار میری آمد سے قبل ہی تھانے پہنچ گیا تھا لہٰذا یہ عین ممکن تھا کہ گاؤں کے کسی آدمی سے اس کی بات ہوئی ہو اور اسے صفدر و لاکھو کی گرفتاری کا پتا چل گیا ہو۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”دو نہیں، میں نے تین افراد کو گرفتار کیا ہے۔ تیسرا آدمی لاکھو کا ساتھی بخشو ہے۔ اسی دہرے قتل کے سلسلے میں ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ وہ تینوں زیرِ تفتیش ہیں۔ انشاء اللہ! بہت جلد کوئی مثبت نتیجہ دیکھنے کو ملے گا اور ہاں......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اب تم باہر جا کر ان بندوں کا چرچا نہ کرنا۔ گاؤں میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے کریماں بی بی کے بیٹے صفدر کو حوالات میں ڈالا ہوا ہے۔ زبان کو کنٹرول میں رکھنا بشیرے۔ سمجھ رہے ہو نا...... میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”جی سمجھ گیا......!“ وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایت کا خیال رکھوں گا جی۔“

میں نے اسے شاباشی دے کر رخصت کر دیا۔

میں نے بشیرے سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ میں واقعی دوپہر کے بعد شمشیر پور جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا، تھانے میں ایک ایمرجنسی آ گئی۔ وہ دنگا فساد کا معاملہ تھا۔ نہری پانی کے استعمال کے سلسلے میں دو زمینداروں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ جھگڑا زبانی بحث و تکرار سے شروع ہو کر سر پھٹول پر جا کر رکا تھا۔ اللہ کا شکر ہے، اس جھگڑے میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا البتہ، فریقین میں دونوں جانب کئی بندے زخمی ہو گئے تھے۔ میں اس معاملے کو سیدھا کرنے میں اس قدر مصروف ہوا کہ سر کھجانا بھی یاد نہ رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں شمشیر پور کا رخ کرتا لہٰذا اس پروگرام کو کل صبح تک موخر کر دیا۔

شمشیر پور کا نام آپ کو عجیب سا لگ رہا ہوگا۔ عموماً گاؤں دیہات، قصبات اور شہروں وغیرہ کے نام کسی مشہور شخصیت کے نام پر رکھے جاتے ہیں پھر اس گاؤں کا نام شمشیر یعنی تلوار کے نام پر کیوں رکھا گیا...... ؟ یہ ایک دلچسپ اور اہم سوال ہے۔

دراصل، اس میں عجیب و غریب اور اچنبھے والی کوئی بات نہیں۔ کسی زمانے میں اس گاؤں میں ایک شہ زور زمان خان رہا کرتا تھا۔ فنِ پہلوانی کے علاوہ اسے تلوار بازی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب یہ خطہ متحدہ ہند ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ زمان خان کا مقابلہ ایک ہندو تلوار باز سے ہونا طے پایا۔ پلٹو رام وقت اور خطے کا مانا ہوا تلوار باز تھا۔ عمومی رائے یہ تھی کہ زمان خان، پلٹو رام کے سامنے دو منٹ بھی ٹک نہیں پائے گا مگر جب مقابلے کا آغاز ہوا تو زمان خان نے عمومی رائے کی تاریخ بدل کر لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ دو منٹ کیا، وہ پورے پندرہ منٹ پلٹو رام کے سامنے ڈٹا رہا تھا اور اس مقابلے کے اختتام پر پلٹو رام کو اپنے تلوار والے بازو سے محروم ہونا پڑا تھا۔ وہ زمان خان کے ایک برق رفتار وار کو سمجھ نہ پایا اور پلک جھپکتے میں اس کا بازو کندھے سے جدا ہو کر زمین پر جا پڑا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ پلٹو رام کی تلوار اسی کٹے ہوئے بازو والے ہاتھ میں دبی رہی تھی۔

اس منظر کی وحشت ناکی نے پلٹو رام کے عزم اور حوصلے کو ریت کی دیوار کے مانند زمیں بوس کر دیا اور وہ مقابلے کے میدان میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد زمان خان کا نام شمشیر خان رکھ دیا گیا اور یہ گاؤں شمشیر پور کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس گاؤں کا پرانا نام اب کسی کو یاد نہیں تھا اور نوجوان نسل میں سے بہت سوں کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ شمشیر خان کون تھا اور ماضی کے کس سنہری کارنامے نے زمان خان کو شمشیر خان بنا دیا تھا۔

ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم ماضی کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ یہ یادداشت کی کمزوری نہیں، بلکہ ہماری تن آسانی ہے اور اس سہل پسندی میں ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ آج اگر ہم ”حال“ ہیں تو گردشِ دوراں کل ہمیں ”ماضی“ بنا دے گی پھر اس وقت کا ”حال“ ہمیں بھی بھولا بسرا ماضی جان کر اتنی ہی آسانی سے فراموش کر دے گا......!

☆☆☆

آئندہ روز میں شمشیر پور جانے کے لیے تھانے سے نکلنے ہی والا تھا کہ مقتولین کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں آ گئیں۔ لاشوں کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کو ایک مناسب جگہ پر رکھوایا اور اپنے کمرے میں آ کر رپورٹ کا جائزہ لینے لگا۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق، ریاض اور فیاض کی موت وقوعہ کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان کسی وقت واقع

ہوئی تھی جبکہ ان کی موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ اس نکتے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا اور میں رپورٹ کو پڑھتا چلا گیا۔ آگے لکھا تھا۔

دونوں مقتولین کے معدوں سے حاصل ہونے والے نمونوں نے ثابت کر دیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے انہوں نے جو کھانا کھایا تھا اس میں کوئی سریع الاثر زہر ملا ہوا تھا۔ اس زہر نے معدے میں پہنچتے ہی اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ اس زہر کی خصوصیت رپورٹ کے مطابق یہ بتائی گئی تھی کہ وہ سب سے پہلے اعصاب اور دماغ کو اپنے زیر اثر لا کر متاثرہ شخص کو غنودگی میں پہنچا دیتا ہے پھر بہت جلد یہ غنودگی گہری نیند میں بدل جاتی ہے اور اسی نیند میں سفر کرتے ہوئے متاثرہ ذہن ابدی نیند کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ ریاض اور فیاض کی زندگی کا چراغ بھی اسی انداز میں گل ہوا تھا۔

رپورٹ میں مزید یہ بھی درج تھا کہ جب ان دونوں بھائیوں کے جسموں کے بالائی حصوں پر تیز دھار کلہاڑی کے وار کیے گئے تو وہ زندگی سے محروم دو لاشوں کی صورت چارپائیوں پر پڑے تھے لہٰذا کلہاڑی بردار کو اپنے کام میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ بڑے اطمینان سے ان کے جسموں کو زخموں سے چور چور کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دو تین مرتبہ بڑی توجہ سے پڑھا پھر ایک طرف رکھ دیا۔ ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ قاتل کا مقصد بھی بڑی حد تک واضح ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے زہر کھلا کر انہیں موت کی نیند سلایا پھر ان پر کلہاڑیاں برسا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ یہ شدید نوعیت کی انتقامی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ کسی دشمن نے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انہیں بڑے بھیانک انداز میں فنا کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس صورتِ حال میں شک کے تمام تر تیر صفدر کی جانب چلتے نظر آتے تھے لیکن میرا ذہن اس کے بالکل برعکس سوچ رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے صفدر اور لاکھو کو بڑی حد تک بے قصور ثابت کر دیا تھا۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ صفدر اس بات پر اختیار نہیں رکھتا تھا کہ کسی بھی طریقے سے ان بھائیوں کے معدوں تک زہر پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔ یقیناً یہ کام کسی اور ہی شخص کا کیا ہوا تھا!

صفدر اور لاکھو کی طرف سے دھیان ہٹا تو میری سوچ میں زاہدہ پروین کا چہرہ ابھر آیا پھر اس کی ایک ایک احترازی حرکت مجھے یاد آنے لگی۔ اس کی جزبز اور ہچکچاہٹ، پس وپیش اور اکتاہٹ کے معنی اور مفہوم واضح ہونے لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، جب میں نے زاہدہ کو بتایا کہ ریاض اور فیاض کو ان کی بے خبری میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ وہ غفلت کی ایسی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے کہ حملہ آور کے خلاف ایک ذرا سی مزاحمت بھی نہ کر سکے!

وہ میری بات سن کر گھبرا گئی تھی اور اسی گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکلا تھا...... ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کا چونکنا اور گھبراہٹ بڑی معنی خیز تھی جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو!

زاہدہ کے مطابق، دونوں بھائیوں نے لگ بھگ رات نو بجے کھانا کھایا اور سونے کے لیے باڑے میں چلے گئے تھے یعنی رات کے کھانے اور سونے کے درمیان انہوں نے اور کوئی شے نہیں کھائی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ رات کا کھانا ہی زہر آلود تھا!

جب میں زاہدہ سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا تو مقتولین کی عدم مزاحمت اور کھانے کی گڑبڑ کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا اور اسی خیال کے تحت میں نے اس سے کھانے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ رات والے کھانے کا کچھ حصہ بچا ہوا ہو تو مجھے دیدے۔ وہ میری اس فرمائش پر بدک گئی تھی اور بڑے تشویش ناک انداز میں اس نے مجھ سے پوچھا تھا...... ''کیوں جی، آپ اس کھانے کا کیا کریں گے؟''

میں زاہدہ کے گھر سے نکلا تو بشیرے اور منظورے سے ملاقات ہو گئی تھی اور ان کی زبانی ایک اور خطرناک حقیقت ابھر کر سامنے آئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ سال بھر پہلے، ایک رات ریاض اور فیاض کا باپ فتح محمد خون کی الٹیاں کرتے ہوئے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔

اس وقت میں نے فتح محمد کی موت کے حوالے سے بشیرے اور منظورے کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ ان لمحات میں میرا ذہن ریاض اور فیاض کے قتل کا معما حل کرنے میں مصروف تھا لیکن اب ...... دونوں بھائیوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا دروا کر دیا تھا۔ فتح محمد اگر خون تھوکتا ہوا مرا تھا تو یہ کسی کالے، پیلے یا نیلے عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا...... مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ فتح محمد بھی زہر خورانی کے باعث ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

پولیس کی تفتیشی گاڑی اٹکل کے پیٹرول سے بھاگتی ہے اور ان لمحات میں میرا اٹکل زاہدہ پروین کی طرف جارہا تھا۔ زاہدہ ایک جوان، خوب رو اور پرکشش عورت تھی۔ اس کا خود سے ایک دوگنا عمر کے شخص کے ساتھ شادی حلق سے اترنے والی بات نہیں تھی۔ فتح محمد کم و بیش ساٹھ سال کا تھا جب اس نے زاہدہ سے شادی کی تھی۔ اس قسم کی تفاوتی شادیاں عموماً بڑے بھیانک نتائج لے کر آتی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ فتح محمد بھی کسی خطرناک سازش کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا گیا ہو...... اور یہ دونوں بھائی تو پھر بھی زاہدہ کی سوتیلی اولاد تھے......!

پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ریاض اور فیاض کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشوں کو تدفین کے لیے شمشیر پور پہنچادوں گا لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے میرے ارادے کو بدل دیا۔

میں نے کانسٹیبل مراد علی کو اپنے پاس بلایا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''مراد علی! تم فوراً شمشیر پور چلے جاؤ۔ جا کر زاہدہ کو بتاؤ کہ اسپتال سے اس کے بیٹوں کی لاشیں آگئی ہیں۔ وہ تھانے آکر انہیں وصول کرلے تاکہ تجہیز و تکفین کی تیاری میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔''

''لیکن ملک صاحب......!'' کانسٹیبل نے متعجب انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آپ کا پروگرام تو کچھ اور تھا......؟''

وہ اس پروگرام کی بات کررہا تھا جس کے مطابق، مجھے لاشوں کے ساتھ بہ ذاتِ خود شمشیر پور جانا تھا۔ اس سلسلے میں میری اس سے تفصیلی بات ہو چکی تھی لیکن میں نے ابھی تک اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے ''نشیب و فراز'' سے آگاہ نہیں کیا تھا لہٰذا اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ پہلے پروگرام کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہے۔ تم سے جو کہا جارہا ہے، بس تم اتنا ہی کرو۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے جناب......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جو آپ کا حکم'' پھر وہ شمشیر پور روانہ ہوگیا۔

کانسٹیبل میرا بھروسے کا آدمی تھا۔ میں نے کسی خاص مقصد کے تحت اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ناآشنا.... رکھا تھا۔ اگر میں اس راز میں اسے بھی شریک کرلیتا تو مجھے پوری امید تھی کہ وہ راز کا امین رہے گا لیکن میں نے فی الحال اس کے لیے بھی سسپنس کی فضا قائم رہنے دی تھی تاکہ جب اچانک اسے اس زاویے کی خبر ہو تو اس کے تن بدن میں سنسنی کی لہر سی دوڑ جائے۔ اس کے لیے یہ ایک سرپرائز ہوتا۔ یقیناً وہ اس سے بے حد محظوظ ہوتا!

میری توقع کے عین مطابق، دو گھنٹے کے اندر مراد علی واپس لوٹ آیا اور وہ اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ تانگے میں زاہدہ پروین بھی موجود تھی جو یقیناً اپنے ''بیٹوں'' کی لاشیں وصول کرنے آئی تھی۔

میں نے فوراً زاہدہ کو اپنے کمرے میں بلالیا اور مراد علی سے کہا کہ وہ دروازے کے باہر موجود رہے۔ جب تک میں زاہدہ کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہوں، وہ کسی کو بھی کمرے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔

زاہدہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور ادھر ادھر نگاہ دوڑانے کے بعد بولی۔ ''کہاں ہیں ان دونوں کی لاشیں؟''

اس کے استفسار میں گہری تشویش پائی جاتی تھی جیسے جواں بیٹوں کی المناک موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہو۔ میں اس دوران میں بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے اس کے تاثرات کا ایکسرے کررہا تھا اور مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں قطعی کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ اس کی تشویش بڑی کھوکھلی اور مصنوعی نوعیت کی تھی۔

''لاشیں میرے کمرے میں نہیں رکھی ہوئیں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ تھانے ہی میں ہیں اور خاصی محفوظ جگہ پر ہیں۔ تم ان کی طرف سے پریشان نہ ہو۔ بس، تھوڑی سی قانونی کارروائی ہوگی پھر ریاض اور فیاض کی لاشیں تمہارے حوالے کردی جائیں گی۔''

''کیسی قانونی کارروائی......؟'' وہ چونکنا نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''گھبرانے والی کوئی بات نہیں زاہدہ۔ تم سکون سے ادھر ہی بیٹھو۔ میں تم سے چند ضروری سوالات کروں گا اور مطمئن ہونے کے بعد تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

''لل...... لیکن......'' وہ ہکلائی۔ ''اب آپ...... کون سے سوال...... کرنا چاہتے ہیں......؟''

''میں نے کہا ہے نا......'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو......؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بے ساختہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''مم...... میں...... نے...... کچھ نہیں کیا......!''

''جبھی تو کہہ رہا ہوں، تمہیں پریشان نہیں ہونا

چاہیے۔'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''بس، پانچ دس منٹ میں، میں تمہیں فارغ کردوں گا...!''

''جج... جی...'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ! تم نے وقوعہ کی رات دونوں بھائیوں کی فرمائش پر ان کی پسندیدہ ڈشیں کڑی، چاول اور کھیر بنائی تھیں انہوں نے ڈٹ کر کھایا اور لگ بھگ نو بجے رات وہ سونے کے لیے باڑے میں چلے گئے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جج... جی...!'' وہ دوپٹے کے پلو سے پیشانی کا پسینا پونچھتے ہوئے بولی۔

وہ اکتوبر کا مہینا تھا اور فضا میں خنکی پائی جانے لگی تھی۔ اس موسم میں پیشانی کے عرق آلود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر زاہدہ کا ماتھا نم ہوا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ... میرا چلایا ہوا تیر نشانے پر جا کر بیٹھا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ذرا سوچ کر بتاؤ زاہدہ... کیا انہوں نے باڑے میں جا کر بھی کچھ کھایا تھا؟''

''نہیں جی... وہ وہاں جاتے ہی سو گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''انہوں نے گھر میں اتنا زیادہ کھانا کھالیا تھا کہ مزید کچھ کھانے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی وہ باڑے میں جانے کے بعد کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے...''

''ہاں، یہ تو تم نے مجھے اس دن بھی بتایا تھا۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''کہ اس رات انہوں نے ایسا ڈٹ کر کھانا کھایا تھا کہ ہانڈی پتیلے سب خالی ہو گئے تھے حتیٰ کہ جب میں نے تم سے کھانے کی فرمائش کی تو تمہیں معذرت کرنا پڑی تھی... ہیں نا زاہدہ؟''

''جی... یہ سب تو ہے۔'' اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ ''لیکن آپ دوبارہ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا اس رات تم نے بھی کڑی چاول اور کھیر کھائی تھی؟''

''جی ہاں... میں نے بھی خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔''

''پھر تم ابھی تک زندہ کیسے ہو؟''

''جی...!'' میرا سوال کسی ہتھوڑے کے مانند اس کے سر پر لگا تھا۔

میں نے تلخی سے کہا۔ ''ہاں زاہدہ! اس کھانے کو کھا کر کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا جیسا کہ وہ دونوں بھائی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور...''

''لیکن ریاض اور فیاض کو تو کلہاڑی کے وار کر کے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی چالاکی سے بولی۔

''یہ تمہارا خیال ہے زاہدہ...!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔''

''کیا... کیا ہے... حقیقت...؟'' وہ دوبارہ اپنی پیشانی کا پسینا صاف کرتے ہوئے مستفسر ہوئی تاہم اس مرتبہ اس کے لہجے میں جارحیت کے بجائے نقاہت کا عنصر شامل تھا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''حقیقت یہ ہے زاہدہ کہ... وقوعہ کی رات دونوں بھائیوں کے شکم میں جو کھانا اترا، وہ زہریلا تھا جسے کھاتے ہی وہ پہلے نیم بے ہوش ہوئے پھر یہ نیم بے ہوشی گہری نیند میں بدل گئی... ایسی نیند جس سے کوئی بیدار نہیں ہو سکتا لیکن...'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''... لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ وہی کھانا تم نے بھی کھایا تھا اور ابھی تک زندہ سلامت نظر آرہی ہو؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ خود کو کسی منجدھار میں گھرا ہوا محسوس کر رہی ہے۔ آخری سنبھالا لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ... کس بنا پر... یہ بات کہہ رہے ہیں...؟''

میں نے میز کی دراز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں...!''

''پھر...؟'' اس نے سہمی ہوئی تحیر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کے سامنے ڈالتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ دونوں بھائیوں نے زہریلا کھانا کھایا اور سو گئے پھر کچھ ہی دیر کے بعد ان کی موت واقع ہو گئی۔ موت کا وقت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان بتایا گیا ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ جب آدھی رات کے بعد ان پر کلہاڑیاں برسائی گئیں تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکے تھے اسی لیے اس دہرے قتل کے جواب میں ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت دیکھنے کو نہیں ملی۔'' میں نے لمحے بھر کا توقف کر کے سانس

ہموار کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''زاہدہ! یہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے جو ایک قابل سرجن کی نگرانی میں تیار کی گئی ہے۔ تم اس میں درج حقائق کو نہ تو جھٹلا سکتی ہو اور نہ ہی چیلنج کر سکتی ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو سچ سچ بتا دو، تم نے اس رات کھانے میں کیا ملایا تھا؟''
''مم...... میں نے کسی چیز میں زہر...... نہیں ملایا......''
وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولی تاہم اس کی آواز میں کوئی دم خم نہیں تھا۔ ''میں...... ان کو کیوں مارنا چاہوں گی۔ میں تو انہیں اپنی سگی اولاد سے زیادہ سمجھتی تھی اور......''
''تم ریاض اور فیاض کو سگی اولاد سے زیادہ سمجھتی تھیں......!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور فتح محمد کو اپنا سگا شوہر...... ہیں نا؟''
اس نے چونک کر ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میں کوئی تھانیدار نہیں بلکہ عفریت ہوں۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر وحشت اور دہشت نے ڈیرا جما لیا تھا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔
''یہ فتح محمد...... کا ذکر...... کہاں سے...... نکل آیا......؟''
''فتح محمد کا ذکر اس لیے نکل آیا کہ مجھے یقین ہے، اسے بھی زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے چٹانی لہجے میں کہا۔
اس کی ہمت جواب دے گئی، مریل سے لہجے میں بولی۔ ''یہ...... آپ کیا...... کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب......؟''
''میں جو بھی کہہ رہا ہوں وہ تم بڑی اچھی طرح سمجھ رہی ہو زاہدہ۔'' میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تم عورت ذات ہو، تفتیش کے کٹھن مراحل کو جھیل نہیں سکو گی۔ سیدھی طرح اپنے جرم کا اقرار کر لو ورنہ......!''
میں نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ خوف زدہ انداز میں اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''ور...... نہ......؟''
میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مجھے مجبوراً فتح محمد کی بچی کھچی لاش کو قبر میں سے نکلوا کر اس کا بھی پوسٹ مارٹم کروانا پڑے گا...... پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا!''
''پپ...... پانی......!'' اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں میں سے آتی محسوس ہوئی۔
میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''میں نے ابھی پانی اور دودھ کا ذکر کیا ہے۔ فکر نہ کرو، تمہیں پانی بھی ملے گا اور دودھ بھی لیکن ابھی بہت سارے سوالات باقی ہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''وہ کالا کلوٹا سانڈ نما تمہارا تایا زاد سلطان تو ادھر گاؤں ہی میں ہے نا۔ میں ابھی چار سپاہیوں کو بھیج کر اسے تھانے بلواتا ہوں۔ میرا خیال ہے، اگر میں اسے تفتیش کی چکی میں ڈالوں تو اس کی زبان سے بڑے مفید انکشافات ہوں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے زاہدہ پروین؟''
اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں رہی تھی۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ خوف اور دہشت کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔
میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے دو کانسٹیبلوں کو شمشیر پور کی جانب دوڑا دیا تاکہ وہ سلطان نامی اس بندے کو پکڑ کر فوراً میرے پاس لے آئیں لیکن افسوس کہ وہ فوری طور پر دستیاب نہ ہو سکا۔ وہ پورے گاؤں میں کہیں نہیں ملا تھا۔ بعدازاں جب میں زاہدہ کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ سلطان ایک دن کے لیے جلال نگر گیا ہے اور کل صبح واپس آئے گا۔
سلطان، زاہدہ کا شریکِ جرم تھا لہٰذا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت تین کانسٹیبلوں کی ایک ٹیم جلال نگر روانہ کی۔ وہ رات ہونے سے پہلے کامیاب لوٹے۔ سلطان کو وہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔
جب سلطان نے یہ دیکھا کہ زاہدہ نے پولیس کی تحویل میں اقبالِ جرم کر لیا ہے تو اس نے سارا الزام زاہدہ پر ڈال دیا۔ اس کے مطابق، وہ زاہدہ کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ زاہدہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کا ''کام'' کر دے تو وہ سلطان سے شادی کر لے گی۔ اس نے سلطان کو باور کرا دیا تھا کہ ریاض اور فیاض اس شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ یہ رکاوٹ ہٹا دے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک ہونے سے نہیں روک سکتی۔ سلطان کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا اور اس کی شکل صورت کی وجہ سے ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ زاہدہ کی صورت میں اسے بیٹھے بٹھائے ایک حسین و جمیل عورت مل رہی تھی اور ایسی عورت کہ جو زمین و جائداد کی مالک بھی تھی۔
وہ لالچ میں آ گیا۔ زاہدہ کی پیش کش میں اس کے لیے بڑی کشش تھی لہٰذا وہ آگ اور خون کے اس کھیل میں

آنکھیں بند کر کے کود گیا۔ اسی نے زاہدہ کو ایک سریع الاثر زہر لا کر دیا اور جائے وقوعہ کو کسی انتقامی کارروائی کا رنگ دینے کے لیے اسی نے مردہ بھائیوں کی لاشوں کو کلہاڑی کے وار کر کے بری طرح بگاڑ دیا پھر ایک ایسی لرزہ خیز کہانی نے جنم لیا جس میں شامل خونیں واقعات دحالات اور اعمال کا کچھ ایسا ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے۔

سلطان نے، ریاض اور فیاض والے معاملے میں زاہدہ کا شریکِ جرم ہونے کا اقرار تو کر لیا تھا لیکن فتح محمد کی موت سے اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''وہ کارنامہ'' زاہدہ نے اپنے بل بوتے پر انجام دیا تھا۔ ریاض اور فیاض سے ''نمٹنا'' اس کے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا بڑی مکاری سے اس نے سلطان کو استعمال کر لیا تھا۔

میں نے ایک موقع پر زاہدہ سے سوال کیا۔ ''اگر یہ معاملہ دب جاتا تو کیا تم واقعی سلطان سے شادی کر لیتیں؟''

''کیا میں آپ کو اتنی ہی بے وقوف نظر آتی ہوں؟'' اس کا جواب بڑا معنی خیز تھا۔

''نہیں......'' میں نے نفی میں گردن ہلائی اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اگرچہ تم اتنی احمق نہیں ہو لیکن ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے فتح محمد سے کیوں شادی کی تھی۔ تم دونوں کی عمروں میں زمین آسمان کا فرق تھا؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہماری عمروں میں تقریباً آدھے آدھے کا فرق تھا لیکن وہ ایک صاحبِ جائداد زمیندار تھا اور مجھے امید تھی کہ......!''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر معنی خیز انداز میں چپ ہو گئی تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''تمہارا یہی خیال تھا نا کہ فتح محمد سال، ڈیڑھ سال میں اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا لیکن وہ ساٹھا پاٹھا ثابت ہوا۔ نہ صرف یہ کہ وہ تم سے شادی کے بعد دوبارہ جوان ہونے لگا تھا بلکہ شادی کے دوسرے سال ہی تمہارے بطن سے اس کی اولاد بھی پیدا ہو گئی۔ اس صورتِ حال نے تمہیں خاصا مایوس کر دیا۔ جب تم نے اپنا منصوبہ ڈوبتا ہوا دیکھا تو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''......تو تم نے سوچا کہ جو کام قدرتی انداز میں نہیں ہو رہا اسے تم اپنے ہاتھوں سے انجام دو گی اور پھر...... ایک رات فتح محمد خون اگلتا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا......!''

زاہدہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے گردن جھکالی۔

یہ اس کے بھیانک جرم کا خاموش اقرار تھا۔

بعدازاں، اس نے اپنے تفصیلی بیان میں بتایا کہ یہ ٹھیک ہے اس نے زمین وجائداد کے لالچ میں خود سے دگنا عمر کے فتح محمد سے شادی کی تھی لیکن وہ ریاض اور فیاض سے کسی نوعیت کی دشمنی نہیں رکھتی تھی۔ یہ سارا فساد اس کے بیٹے فرمان علی کی پیدائش کے بعد اٹھا تھا۔ جیسے جیسے فرمان علی بڑا ہو رہا تھا، دونوں بھائیوں کے تیور بدلتے جا رہے تھے۔ وہ فرمان علی کو اپنے لیے ایک خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا، فتح محمد کے صرف وہ ہی وارث ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے فتح محمد کے کان بھی بھرنا شروع کر دیے تھے۔ فضا کا رنگ بدلتے دیکھا تو زاہدہ نے اس گھر میں اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بہت خطرہ محسوس کیا چنانچہ ایک رات اس نے فتح محمد کا کام تمام کر دیا۔

چند ماہ امن وامان سے گزر گئے پھر ریاض اور فیاض کے رویے میں نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ زاہدہ نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اسے اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ یہ وہ کیسے ہونے دیتی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ان کے خلاف کوئی چال چلتے، اس نے سلطان کی مدد سے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

زاہدہ کے اقبالی بیان میں کس حد تک حقیقت تھی اس کو چیک کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے بیان کی تصدیق یا تردید صرف وہ دونوں بھائی ہی کر سکتے تھے جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے تھے۔ البتہ، اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں تھا کہ زاہدہ ایک لالچی، سازشی اور مجرم ذہن عورت تھی۔

زمین وجائداد کا لالچ اور دولت کی ہوس بہت ہی گھناؤنی اور خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنے، بے گانے کا فرق مٹا کر انسان کو تباہی وبربادی کے عمیق غار میں پھینک دیتی ہے۔ یہی حرص اور ہوس زاہدہ کو بھی لے ڈوبی۔ جس مقصد کے حصول کے لیے اس ایک نے تین انسانی جانوں کو ختم کر ڈالا وہ پورا نہ ہو سکا۔

وہ اپنے گلے میں ''تین بٹا ایک'' کا طوق سجا کر جیل چلی گئی۔ اسے تو اپنے کیے کی سزا ملی سو ملی لیکن اس کے کرتوتوں کا سب سے زیادہ خمیازہ ننھے فرمان علی کو بھگتنا پڑا تھا۔ وہ معصوم دو سال کی عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہوا اور تین سال کی عمر میں ممتا کی گود اس سے چھن گئی۔

پتا نہیں، اس جھمیلے میں اس بے چارے کا کیا قصور تھا!

(تحریر حُسام بٹ)